جگنو کا مٹھو

(علامہ اقبالؒ کے اشعار سے لبریز دلچسپ کہانیاں)

تسنیم جعفری

اقبال اکادمی پاکستان

اس کتاب کی اشاعت قومی ورثہ وثقافت ڈویژن کے خصوصی مالی تعاون سے ہوئی

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومتِ پاکستان

قومی ورثہ وثقافت ڈویژن

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 36314510, 99203573

Fax: [+92-42] 36314496

Email: info@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-598-1

طبع اوّل	:	۲۰۲۵ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۴۰۰ روپے
مطبع	:	ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور

محل فروخت: سیلز آفس، اقبال اکادمی پاکستان، سروسز بلاک، ایوان اقبال کمپلیکس، لاہور

فہرست

پیش لفظ	۵
جگنو کا مٹھو	۷
بازگشت	۲۵
ہمت	۳۵
دو دوست	۴۱
بکری کی نصیحت	۶۳
بیداری	۶۵

پیش لفظ

انسان ہر دور میں اپنی پسندیدہ اور محبوب شخصیات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اسے اپنے خوبصورت ترین الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہے۔ شاعر مشرق، حکیم الامت ڈاکٹر محمد علامہ اقبالؒ جس طرح ہر چھوٹے بڑے پاکستانی کے پسندیدہ شاعر ہیں اسی طرح مجھے بھی بے حد پسند ہیں اور میں بھی انھیں بہت اچھے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ آپؒ وہ انسان ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور ایک نئی مملکت کا خواب دکھایا، اگر آپؒ نے کل پاکستان کا خواب نہ دیکھا ہوتا تو آج ہم پاکستان میں نہ بیٹھے ہوتے، اس لیے ان کی تعریف میں ہم جتنا بھی کہیں کم ہے۔

اقبالؒ جانتے تھے کہ بچے کسی بھی قوم کے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اس لیے آپؒ نے بچوں کے لیے خصوصی نظمیں لکھیں جن میں سب سے مقبول یہ دعا ہے جو ہر سکول میں پڑھی جاتی ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

آپؒ اکثر بچوں کے ساتھ شعر شعر میں ہی مذاق اور دل لگی بھی کیا کرتے تھے، نواب سر ذوالفقار علی خان آپؒ کے بہت عزیز دوست تھے جن کی کوٹھی پر اقبالؒ اکثر ان سے ملنے جایا کرتے تھے، نواب صاحب کے بیٹے اس وقت نو دس سال کے تھے اور دن بھر اپنی کوٹھی میں لگے سفیدے کے درختوں سے نکلنے والا گوند کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے تھے۔ چھوٹے نواب کہتے ہیں کہ علامہؒ جب بھی آتے گاڑی سے اترتے ہی مجھے بلاتے اور پوچھتے: ''چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟''

میں کہتا: ''گوند نکال رہا ہوں''۔

تو فرماتے: ''چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے''

میں کہتا: ''بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر ختم ہوگئی؟''

تو فرماتے: ''ہاں بھئی ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے۔''

میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپؒ کیسے شاعر ہیں، دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے۔ آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا: ''لو چھوٹے میاں، آج ہم نے دوسرا مصرع بھی کہہ لیا۔'' بولے:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے　　　اور ہو گی ان کی شادی کسی نیک بخت سے!

یہ شعر سن کر میں بہت شرمایا اور گھر کے اندر بھاگ گیا، پھر کبھی ان سے شعر کا تقاضا نہیں کیا۔

اقبالؒ نے نوجوانوں اور طالب علموں کے لیے بھی خصوصی اشعار کہے، لیکن طالب علموں کو ہمیشہ اقبالؒ کے اشعار مشکل لگتے ہیں اور وہ ان کو سمجھنے کے بجائے ان سے جان چھڑاتے ہیں، جبکہ ان اشعار میں ہی ایک پاکستانی مسلمان کی ترقی کا راز چھپا ہے اس لیے ہر ایک فرد کے لیے ان کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک بار آپ اقبالؒ کے اشعار سمجھ جائیں تو آپ کو ان کی شاعری سے محبت ہو جائے گی، جیسا کہ مجھے ہے۔ میں جب میٹرک میں پڑھتی تھی تب ہی سے اقبالؒ میرے پسندیدہ ترین شاعر ہیں، سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان کے علاوہ کسی اور کو پڑھنا ضروری ہی نہیں سمجھا۔ اقبالؒ کے شاہین سے متعلق مجھے تمام اشعار زبانی یاد تھے۔ اسی لیے میں نے اس کتاب ''جگنو کا مٹھو'' میں ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو علامہ اقبالؒ کے پیارے پیارے اشعار سے لبریز ہیں، اس طرح شاید بچوں اور نوجوانوں کو اقبالؒ کی شاعری سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ بھی میری طرح اقبالؒ کے اشعار سے محبت کرنے لگیں۔ کسی بھی چیز کو دل سے سمجھنے کے لیے اس سے محبت کرنا ضروری ہوتا ہے۔

دورِ حاضر کے عظیم شاعر فیض احمد فیض نے علامہ اقبالؒ کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر　　　آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں　　　پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

علامہ اقبالؒ ہمارے لیے شاعری کی صورت میں ایسا بیش بہا خزانہ چھوڑ گئے ہیں کہ ان سے ساری عمر بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جب ان اشعار پر کہانی لکھنے کا سوچا تو خود بخود شعر سامنے آتے گئے۔ امید ہے آپ کو بھی یہ کہانیاں پسند آئیں گی۔

تسنیم جعفری

جگنو کا مٹھو

جگنو کو صبح دیر تک سونے کی عادت تھی جس سے شاہین آپا کو بہت چڑ تھی، کیونکہ وہ رات کو دیر تک جاگتا تھا اس لیے صبح سکول کے لیے اٹھا نہیں جاتا تھا، چھوٹی بہن شمع بھی دیر تک پڑی رہتی تھی بستر پر لیکن شاہین آپا کی ڈانٹ کے ڈر سے جلدی اُٹھ جاتی تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم اتنی دیر تک کیسے پڑے رہتے ہو بستر پر، میری تو کمر دکھ جاتی ہے اگر دیر تک لیٹی رہوں!'' شاہین نے جگنو کو تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا

''ارے آپا.. میرا بستر ہی اتنا نرم ہے کہ اس میں گھس جاؤں تو پھر نکلا نہیں جاتا، دل چاہتا ہے کہ بس سوتا رہوں، سوتا رہوں۔''

''آپا آپ کا بستر سخت ہے نا اس لیے آپ سے زیادہ دیر لیٹا نہیں جاتا۔'' شمع نے مسکراتے ہوئے طنز کیا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا

شاہین آپا نے ان دونوں کی بات کا جواب اقبالؒ کا شعر پڑھ کر دیا۔

''ویسے بھی شاہین کا بسیرا تو پہاڑوں کی چٹانوں پر ہوتا ہے نا!'' جگنو چڑ کر نیند میں ہی بولا۔

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزہء کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

شاہین کے اشعار شروع ہوئے تو جگنو بستر چھوڑ کر بھاگا۔ شاہین آپا کبھی اس پر پانی ڈالتیں تو کبھی علامہ اقبالؒ کے اشعار سناتیں جن سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے اٹھ کر غسل خانے میں گھس جاتا۔ سکول جاتے ہوئے کمرہ پھیلا کر جاتا اور سکول سے آ کر بھی سارے کمرے

میں اس کے کپڑے، جوتے، موزے اور کتابیں بکھری ہوتیں جنھیں کبھی شاہین آپا تو کبھی شمع کو سمیٹنے پڑتے تھے کیونکہ اگر امی دیکھ لیتیں تو جگنو کی خوب مرمت کرتی تھیں جو شاہین آپا اور شمع نہیں چاہتی تھیں اس لیے چپ کر کے خود ہی سمیٹ دیتی تھیں کیونکہ جگنو سب کا لاڈلا بھائی جو تھا۔

''یا اللہ! اس لڑکے کا کیا بنے گا؟''۔شاہین آپا ایک دن تنگ آ کر بولیں۔

''جو مری ہستی کا مقصد ہے' مجھے معلوم ہے!'' جگنو غنودگی میں ہی بولا، اس کے منہ سے اقبالؒ کے شعر کا مصرع سن کر شاہین آپا چونک گئیں اور خوش بھی ہوئیں کہ اس کو بھی اقبالؒ سے محبت ہو گئی۔

''حیران نہ ہوں آپا، یہ اقبالؒ کی محبت نہیں بلکہ آپ کی صحبت کا اثر ہے، یہ جو آپ دن رات اقبالؒ کے اشعار ہنٹر کی طرح میرے سر پر برساتی رہتی ہیں تو مجھے بھی کوئی نہ کوئی شعر یاد رہ جاتا ہے.... مجبوری ہے۔'' اس کا جواب سن کر آپا نے اس کے سر پر کشن کھینچ مارا اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔

گھر میں ابو اور دادی جان کو علامہ اقبالؒ بہت پسند تھے اس لیے انھوں نے شاہین کو اردو ادب پڑھایا اور ایم اے اردو کرنے کا مشورہ دیا، انھوں نے ایم اے میں مضمون اقبالیات رکھا جس سے انھیں اقبالؒ کے تمام اشعار یاد ہو گئے اور وہ انھیں گھر میں بھی دہراتی رہتی تھیں اور ہر بات اشعار کے آئینے میں کہنے کی عادی ہو گئی تھیں، اکثر ابو اور دادی جان سے مقابلہ رہتا تھا جس سے چھوٹے بہن بھائی جگنو اور شمع کی جان جاتی تھی۔

''دادی جان !عالی بھائی کا لندن سے فون آیا ہے، سکائپ پر ہیں ِ جلدی سے آ جائیں۔'' جگنو دادی کو بلانے آیا جو اپنے کمرے میں عشاء کی نماز ادا کر کے تسبیح پڑھ رہی تھیں، پھر تسبیح مکمل کر کے اپنے بڑے پوتے عالی کی صحت سلامتی کی دعا کی۔

''دادی جان کبھی میرے لیے بھی اس طرح ہاتھ پھیلا کر دعا کر دیا کریں۔'' جگنو نے احتجاج کیا۔

''ارے بیٹا، وہ تو اتنی دور پردیس میں بیٹھا ہے اس کے لیے دل بہت دکھتا ہے میرا، تم تو ہر وقت میرے سامنے رہتے ہو... میری دعاؤں کے حصار میں۔'' دادی نے اپنی نماز کی چوکی

سے اٹھتے ہوئے جگنو پر پھونکا۔

''السلام علیکم میری پیاری دادی جان! کیسی ہیں آپ؟'' عالی نے وڈیو کیمرے کے ذریعے دادی کو آتے دیکھا تو سلام کیا۔

جا بسا ہے مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

''ارے ایک تو اس عمر میں دادی کو چھوڑ کر دور دیس چلے گئے ہو، اب کیا خیریت پوچھتے ہو، بس دن گنتی ہوں کہ کب واپس آؤ گے۔''

''ابھی کہاں دادی جان، ابھی تو نئی نئی نوکری لگی ہے۔'' عالی بھی اداس ہوتے ہوئے بولا:

''خوش تو ہے نا میرا بچہ..؟'' امی نے بھی کیمرے میں جھانک کر عالی سے پوچھا، ''ہمیں یاد بھی کرتا ہے کہ بھول گیا؟''۔

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

عالی صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

آگیا آج اُس صداقت کا مجھ کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

شاہین بھی اپنا کام چھوڑ کر بولی جو ان سب کی گفتگو سن رہی تھی اور عالی بھائی کو یاد کر کے دکھی ہو رہی تھی۔

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

عالی سب کی اداسی دیکھ کر بولا۔

''افففف....! ایک تو میں اقبالؒ کے ان اشعار سے تنگ آ گیا ہوں جو دونوں اطراف سے داغے جاتے ہیں...!'' جگنو اپنا سر پکڑ کر بے زاری سے بولا، ''اب رات بھر مجھے نیند میں بھی یہ

ثقیل اشعار بدہضمی کرتے رہیں گے۔''

''ارے جگنو بھائی... تم تو ویسے بھی ساری رات جاگتے ہو، تمھیں کیا فرق پڑے گا۔'' شمع بولی جو عام طور پر خاموش رہتی تھی لیکن جگنو کے معاملے میں ضرور بولتی تھی۔

جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری...!

شاہین بولی تو جگنو دانت پیس کر رہ گیا۔

''شاہین آپا آپ بھی نا....!'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عالی بھائی کے سامنے چپ کر گیا کیونکہ انھوں نے جاتے ہوئے جگنو سے وعدہ لیا تھا کہ بہنوں کو تنگ نہیں کرے گا۔

''چلو اب سب خدا حافظ کہہ دو عالی کو، اسے بھی اداس کر دیا آپ لوگوں نے۔'' ابو نے دادی جان کے ہاتھ سے موبائل لے کر عالی کو دعا دی اور خدا حافظ کہا۔ رات چونکہ کافی ہوگئی تھی اس لیے سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ شاہین نے دیکھا کہ جگنو سونے کے بجائے لان میں بیٹھا چاند کو تک رہا ہے، آج چودھویں کی رات تھی اور مکمل چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھا گئے اور چاند نے بادلوں میں منہ چھپا لیا۔ شاہین یہ دیکھ کر بولی:

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ چھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر

''ارے آپا آپ...؟ آپ سوئی نہیں ابھی تک؟''۔ جگنو اس وقت آپا کو لان میں دیکھ کر حیران ہوا۔

''میرا بھائی اس وقت یہاں اکیلا بیٹھا تھا اس لیے دیکھنے چلی آئی کہ ماجرا کیا ہے؟''۔

''کچھ خاص نہیں، موسم بہت اچھا لگا اس لیے یہاں بیٹھ گیا، انسان رات کو کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے اور چاند کو نہ دیکھے یہ ناانصافی ہوگی۔ اور یہ آپ موقع کی مناسبت سے اتنے پرفیکٹ شعر کیسے ڈھونڈ لیتی ہیں؟'' جگنو بولا: ''بھئی بات ہے محبت کی، مجھے شاعری سے اور شاعرِ مشرق سے محبت ہے اس لیے شعر یاد رہتے ہیں''۔

* * * *

جگنو اور شمع کی سکول سے آتے ہی دروازے کے اندر رکھے پنجرے پر نظر پڑی تو وہ خوشی اور حیرت سے چیخ کر بولے:

''ارے یہ طوطو کہاں سے آیا..؟''

''پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں..!'' پنجرے سے آواز آئی

''اوہ، یہ آواز کہاں سے آئی..؟ کیا یہ طوطا بولا تھا..؟''۔شمع نے حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''لیکن یہ شعر تو اقبالؒ نے شاہین کے لیے کہا تھا....طوطے کے لیے تو نہیں کہا تھا..!''۔ جگنو سوچتے ہوئے بولا۔

''اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو بننا!''۔شمع بولی، پھر دونوں بھاگے بھاگے باورچی خانے میں گئے جہاں امی کھانا بنا رہی تھیں۔

''امی وہ طوطا کون لایا ہے..؟''۔دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا

''وہ تمھاری شاہین آپا لائی ہیں..!ان کے اردو کے پروفیسر ایک ماہ کے لیے ملک سے باہر گئے ہیں، کسی سیمینار میں شرکت کے لیے،تو ان کی نظر میں شاہین ہی وہ بہترین فرد تھی جو اس فلاسفر طوطے کی نگرانی کرسکتی ہے''۔امی بولیں۔

''چلو.....! یک نہ شُد دو شُد''۔جگنو بولا،''پہلے کیا شاہین آپا کم تھیں فلسفہ جھاڑنے کے لیے جواب یہ بولنے والا طوطا بھی ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے..!''۔

''بس ایک ماہ کی تو بات ہے...پھر وہ اسے واپس لے جائیں گے''۔امی بولیں۔

''مگر امی....اس طوطے کو تو اقبالؒ کے اشعار بھی یاد ہیں..یہ بڑی حیرت کی بات ہے!''۔ شمع بولی۔

''بیٹا آپ لوگوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کیوں کہ آپ لوگوں کو اردو سے دلچسپی نہیں ہے،لیکن یہ طوطا تو بچپن سے ہی پروفیسر صاحب کے پاس ہے انھوں نے اقبالیات میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے،انھیں خود بھی اقبال کا پورا کلام زبانی یاد ہے،اور جیسے جیسے وہ اشعار پڑھا کرتے

تھے تو اس مٹھو کو بھی وہ شعر یاد ہوتے گئے..!''۔

''اوہ ....بہت تھک گیا!''۔جگنو لاؤنج میں آیا، بیگ ایک طرف پھینکا اور جوتوں سمت صوفے پر گر گیا، پھر وہیں سے بولا،''شمع جلدی سے اے سی چلا دو گرمی سے برا حال ہو رہا ہے''۔

''رہنے دو بھائی ...اب ایسی بھی گرمی نہیں ہے، آج تو موسم اچھا ہے۔'' شمع بے زاری سے بولی۔

''چلاتی ہو یا...!''۔جگنو نے کشن اُٹھا کر ہوا میں لہرایا جیسے اس کو دے مارے گا۔

''خود کیوں نہیں چلا لیتے....مجھ پر ہی رعب ڈالتے رہتے ہو ہر وقت، جاؤ نہیں چلاتی بد تمیز کہیں کے!''،شمع بھی ایک کشن لے کر قالین پر دراز ہوگئ۔

''اچھا بہن معاف کر دو، آئندہ بد تمیزی نہیں کروں گا۔ دیکھو اب تو معافی مانگ لی ہے نا اب تو چلا دو اے سی، ورنہ میں گرمی سے مر جاؤں گا۔تم اے سی کے قریب بیٹھی ہو اس لیے تم سے کہا''۔جگنو نے دیکھا کہ رعب سے کام نہیں چل رہا تو التجا شروع کر دی۔

''ارے بھئی یہ کس بات پر بحث ہو رہی ہے ..؟ تم دونوں تو لگتا ہے پیدا ہی جھگڑا کرنے کے لیے ہوئے ہو!'' دادی جان اپنے کمرے سے تسبیح پڑھتی ہوئی نکلیں، وہ ظہر کی نماز ادا کر رہی تھیں،ان کی بحث سن کر باہر آ گئیں۔

''السلام علیکم دادی جان! دیکھیں نا میں اتنا تھکا ہوا ہوں اور شمع کو میرا ذرا خیال نہیں ہے!''۔جگنو ذرا اور صوفے میں دھنستے ہوئے خفگی سے بولا:

تیرے صوفے ہیں افرنگی، تیرے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

''ہیں ں ں ں....!''۔ان تینوں نے حیرت سے مٹھو کو دیکھا۔

''دادی جان! پہلے آپا کیا کم تھیں ہم پر تنقید کرنے کے لیے جو اب اس مٹھو کو بھی لے آئی ہیں...! یا اللہ ایک ماہ کیسے گزرے گا؟'' جگنو بے چارگی سے بولا۔

''چلو بیٹا اُٹھو! جاؤ جا کر پہلے یونیفارم بدلو، ہاتھ منہ دھو پھر یہاں آنا'' دادی جان بولیں۔

’’نہیں دادی جان ...ابھی میرا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہ رہا، پہلے کھانا کھاؤں گا پھر سوچوں گا، آپ شمع کو کہیں اے سی چلائے اور ٹی وی کا ریموٹ مجھے اُٹھا کر دے۔‘‘ جگنو نے پھر آڈر جاری کیا تو مٹھو بھی بولے بنا نہ رہ سکا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

’’دادی جان میں اسے جان سے مار دوں گا‘‘۔جگنو نے کشن اُٹھا کر مٹھو کے پنجرے پر دے مارا، اس اچانک حملے پر مٹھو کی جان ہی نکل گئی۔

’’ارے ارے.....یہ کیا ہو رہا ہے؟ مارو گے بے زبان کو؟‘‘۔آپا غصے سے بولیں جنھوں نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے سب دیکھ لیا تھا۔

’’اففففف..! اللہ میری توبہ، یہ بے زبان ہے؟‘‘۔جگنو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا بولا، ’’اتنا تو کوئی پروفیسر بھی نہیں بول سکتا، اس نے تو آتے ہی میرا سکون برباد کر دیا ہے۔دیکھنا میں اسے گھر سے نکال کر ہی رہوں گا‘‘۔جگنو غصے سے پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

’’لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں...!‘‘ پیچھے سے مٹھو کی آواز آئی تو جگنو نے کمرے میں گھس کر زور سے دروازہ بند کر لیا۔

’’چلو کوئی تو آیا اس شہزادے پر اعتراض کرنے والا، ہماری بات کو تو اہمیت ہی نہیں دیتا تھا‘‘۔آپا بڑبڑائیں، ’’چلو محترمہ تم بھی اُٹھو اور کمرے میں جا کر یونیفارم بدلو کیا یہیں ڈیرے ڈال دیے ہیں‘‘۔آپا نے حکم دیا تو شمع بھی منہ بناتی ہوئی کمرے کی طرف چل دی۔

* * * *

شام کو جگنو اور شمع تیار ہو کر باہر لاؤنج میں آئے، انھیں اپنے چچا زاد بھائی کی سالگرہ پر جانا تھا۔شمع جلدی سے دادی جان کے پاس آئی اور پوچھا، ’’میں کیسی لگ رہی ہوں؟‘‘۔جگنو بھی بھاگ کر آیا اور بولا، ’’نہیں دادی جان پہلے بتائیں کہ میں کیسا لگ رہا ہوں؟‘‘۔

’’تم دونوں ہر وقت مقابلہ بازی نہ کیا کرو، بچے نہیں ہو اب میٹرک میں آ گئے ہو..!‘‘

دادی جان پریشان ہو کر بولیں، ''ارے تم دونوں ہی میری آنکھ کا تارا ہو...اب کیا بتاؤں کہ کون زیادہ اچھا لگ رہا ہے..!''

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

پیچھے سے مٹھو کی آواز آئی:

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

''واہ واہ مٹھو بھائی ...! کیا شعر ڈھونڈ کر نکالا ہے...دل خوش کر دیا''۔ جگنو خوشی سے بولا، ''آج تو ہم تمھارے گرویدہ ہو گئے! آج اپنے ہونے کا احساس ہوا ہے، ورنہ لگتا تھا کہ بے معنی ہے میری زندگی تو..!''

''شکریہ شکریہ.....نوازش!''۔ مٹھو پھر بولا:

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

''آپ کچھ غلط کہہ گئے مٹھو بھائی، دراصل ہمارے اس جگنو کو تو تپش ملی ہے قدرت سے!''۔ شمع بولی۔

''تم جلتی رہنا میری تعریف سے بہن......نام ہی شمع ہے، جلے نہ تو کیا کرے''۔

اتنے میں باہر گاڑی نے ہارن بجایا تو وہ جلدی سے باہر بھاگے، ان کے کزنز انھیں لینے آ گئے تھے۔

* * * *

جگنو اور شمع سالگرہ سے لوٹے تو رات کے دس بج رہے تھے، آتے ہی وہ دونوں ٹی وی کے آگے بیٹھ گئے کیونکہ ان کا پسندیدہ پروگرام آ رہا تھا۔

''ہو گئی تمھاری پارٹی ختم..؟''۔ آپا اپنے کمرے سے نکل کر آئیں، ''اور آتے ہی اب ٹی

وی کے سامنے فِٹ ہو گئے ہو ...... کوئی فرض ہے یہ پروگرام دیکھنا کہ اگر نکل گیا تو گناہ ہوگا...! کوئی اپنی پڑھائی کا بھی ہوش ہے تم لوگوں کو کہ نہیں..؟''۔

''چھوڑیں آپا کیا رکھا ہے پڑھائی میں...دیکھیں کتنا اچھا پروگرام ہے۔'' جگنو انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے

مٹھو نے لقمہ دیا۔

''آپا دراصل سکول میں کوئی خاص پڑھائی تو ہوتی نہیں، سمجھ نہیں آتا کیا پڑھیں کیا نہیں..!''۔ شمع نے صفائی پیش کی۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مٹھو نے ان کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی۔

''ارے بھئی مٹھو یہ صداقت اور شجاعت صاحب کس سکول کے اساتذہ ہیں، کیا ہمیں ٹیوشن رکھوا رہے ہو..؟'' جگنو نے مٹھو کا مذاق اڑایا۔

''بھئی میں تو امامت نہیں کر سکتی کیونکہ میں لڑکی ہوں لہٰذا یہ شعر تو تمھارے لیے ہی ہے''۔ شمع نے سارا بوجھ جگنو پر ڈال دیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے..؟ ہر بات مذاق میں اُڑا دیتے ہو، اور مٹھو میاں کا ادب کیا کرو یہ میرے پروفیسر صاحب کا مٹھو ہے کوئی گرا پڑا عام طوطا نہیں ہے۔'' آپا بگڑتے ہوئے بولیں۔

''اس ذرہ نوازی کے لیے شکریہ آپا..!'' مٹھو عاجزی سے بولا۔

''لو بھئی اس نے تو تمھیں بہن بنا لیا... مٹھی آپا۔'' جگنو نے پھر مذاق اُڑایا۔

''یہ مٹھی آپا کیا ہوتا ہے..؟''۔ شمع نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی مٹھو کی بہن مٹھی ہوئی نا..!''۔ جگنو نے وضاحت کی۔

''ٹھہر جاؤ بدتمیزو! تم لوگ اس طرح باز نہیں آؤ گے، میں تمھیں ابھی بتاتی ہوں...!''۔ آپا

انھیں مارنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈنے لگیں تو ان دونوں نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اور مٹھو کی آواز دور تک ان کا پیچھا کرتی رہی، وہ کہہ رہا تھا؛

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لیے جہاں میں فراغ

* * * *

آج اتوار تھا، ٹی وی پر انڈیا اور پاکستان کا کرکٹ میچ آ رہا تھا لہٰذا جگنو اور شمع کا سارا دن ٹی وی کے آگے گزرا، جگنو ساتھ ساتھ میچ پر رواں تبصرہ بھی پیش کر رہا تھا، ہر بال پر اس کا ردِعمل دیکھنے والا تھا۔ اتنے میں احمد شہزاد نے ایک اور وکٹ لے لی۔

''واہ واکیا وکٹ لی ہے ..! شاباش میرے بھائی....سکھا دے سبق ان ہندوستانیوں کو۔ آخر انھوں نے پاکستان کو سمجھا کیا ہے، ہرا دیں گے اتنی آسانی سے یہ ہمیں''۔ جگنو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

مٹھو نے بھی لقمہ دیا جو صبح سے میچ دیکھ رہا تھا اور کمنٹری جگنو کی زبانی ایکشن کے ساتھ سن رہا تھا۔

''ارے واہ مٹھو صاحب! آپ نے تو خوش کر دیا کیا شعر پڑھا ہے..!''۔ جگنو نے قریب آ کر پنجرے کو تھپتھپایا اور اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ شور سن کر آپا بھی کمرے سے باہر آ گئیں اور یہ سب دیکھ کر ان کی چیخ ہی نکل گئی۔

''غضب خدا کا...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ مٹھو کو بھی میچ دکھا رہے ہو، پروفیسر صاحب کو علم ہو گیا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے''۔

''خس کم جہاں پاک..!'' جگنو ہاتھ اوپر اُٹھا کر آہستہ سے بولا، آپا مٹھو کا پنجرہ اُٹھا کر لے گئیں اور وہ احتجاج کرتا رہ گیا۔

رات کو کہیں جا کر میچ ختم ہوا، پاکستان میچ جیت گیا تھا۔ جگنو اور شمع کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ

نہیں تھا، وہ دونوں خوشی خوشی بھنگڑا ڈالتے ہوئے کچن میں آئے جہاں آپا رات کے کھانے کے برتن دھو رہی تھیں اور مٹھو ساتھ بیٹھا تھا۔

''مبارک ہو مٹھو ... پاکستان میچ جیت گیا''۔ جگنو ناچتے ہوئے بولا، ''واہ کیا مارا ہے ... بڑا زور ہے ہماری ٹیم میں''۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مٹھو نے جلدی سے شعر پڑھا۔

''بھئی تمھارے شعروں نے تو ہندوستانی ٹیم کو ہلا کر رکھ دیا مٹھو..!'' جگنو نے مٹھو کو شاباش دی۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

''چلو باہر نکلو تم دونو، مٹھو کو بھی خراب کر کے چھوڑو گے..!''۔ آپا نے ڈانٹا۔

''ویسے آپا.. یہ مٹھو بچپن سے پروفیسر صاحب کے ساتھ ہے لیکن پھر بھی اتنا بدمزاج نہیں ہوا جتنا چند سالوں میں آپ ہو گئی ہیں۔'' جگنو نے آپا کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا تو وہ برتن چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگیں، وہ ہاتھ نہیں آیا تو جا کر ابو سے شکایت کر دی۔ ابو نے اس کے لیے یہ سزا تجویز کی کہ جگنو ایک ہفتے تک آپا سے اردو پڑھے گا اور شعروں کی تشریح یاد کر کے سنائے گا کیونکہ وہ اردو کے ماہانہ ٹیسٹ میں فیل ہو گیا تھا

* * * *

''کل اتوار ہے اور ہم سب پکنک پر جائیں گے..!'' جگنو نے سکول سے آتے ہی اعلان کیا:

''کون لے کر جائے گا تمھیں پکنک پر..؟''۔ آپا نے طنز کیا۔

''ابو ....اور کون! انھوں نے پچھلے ہفتے وعدہ کیا تھا کہ اگر پاکستان میچ جیت گیا تو ہمیں پکنک پر لے جائیں گے۔ امی جب رات کو ابو آجائیں تو انھیں یاد کرا دیجیے گا۔

''کیا بکواس ہے یہ.... پاکستان میچ جیت گیا تو ابو تم لوگوں کو پکنک پر لے کر جائیں

گے..! میں تو نہیں جاؤں گی دادی جان کے پاس رہوں گی۔'' آپا غصے سے بولیں۔

''مگر بیٹا میں تو صبح تمھارے چچا کی طرف جاؤں گی، تم چلی جانا پکنک پر....کبھی کبھار گھوم بھی لینا چاہیے، باغ کی سیر سے دماغ کھلتا ہے''۔ دادی جان نے مشورہ دیا۔

''بالکل ٹھیک کہا دادی جان...انھیں بہت ضرورت ہے دماغ کھولنے کی، پتہ نہیں کب سے بند پڑا ہے، بھوت بنگلہ بن گیا ہے''۔ جگنو ہنستے ہوئے بولا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو ورنہ...!''۔ آپا اسے مارنے کے لیے دادی جان کے نیچے سے کشن کھینچنے لگیں تو ساتھ ہی ان کی تسبیح بھی کھنچ کر ٹوٹ گئی۔

''ارے....بیٹا یہ کیا کیا تم نے؟ غصے میں میری تسبیح ہی توڑ ڈالی..! اتنا غصہ بھی ٹھیک نہیں ہوتا، بھائی تو مذاق کر رہا تھا''۔ دادی جان تسبیح کے دانوں کو دیکھ کر تاسف سے بولیں۔

''معاف کر دیں دادی جان! یہ سب اس جگنو کا قصور ہے، اسے کیا ضرورت ہوتی ہے بلا وجہ مذاق کرنے کی..!''۔ آپا جگنو کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ارے دادی جان میں ابھی ٹھیک کر دیتا ہوں،'' جگنو فرماں برداری سے بولا اور جلدی جلدی تسبیح کے دانے اکٹھے کرنے لگا، ''جاؤ شمع سوئی دھاگہ لے کر آؤ''۔

''ارے بیٹا رہنے دو، بہت مشکل ہے قالین پر دانے کہاں نظر آئیں گے..!''۔ دادی فکر مندی سے بولیں۔

''ارے دادی جان آپ فکر ہی نہ کریں؛

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

''ارے بھائی! تم نے تو اقبال کا شعر پڑھ دیا، تمھیں کیسے یاد ہو گیا..؟'' شمع حیرت سے بولی۔

''بھئی یہ سب تو مٹھو کی دوستی کا کرشمہ ہے کہ مجھے بھی اقبالؒ کے اشعار سے دلچسپی ہو گئی ...کیوں مٹھو بھیا..؟''۔

''ذرہ نوازی ہے جگنو میاں!''۔ مٹھو شرماتے ہوئے بولا۔

* * * *

اگلے دن صبح صبح سب تیار ہو کر تمام ساز و سامان سمیت گاڑی میں آ بیٹھے۔ آگے امی ابو بیٹھے تھے، پیچھے جگنو اور شمع بیٹھے درمیان میں مٹھو کا پنجرہ رکھا تھا۔ آپا بیٹھنے کے لیے آئیں تو ان کے لیے جگہ نہ تھی، انھیں بے حد غصہ آیا:

''یہ مٹھو یہاں کیا کر رہا ہے..کون لایا ہے..؟ نیچے اتارو اسی وقت!''۔

''ارے ارے آپا..! ذرا ادب سے بات کریں آخر آپ کے پروفیسر صاحب کا مٹھو ہے..!''۔

''تم اپنی بکواس بند کرو! میں کہاں بیٹھوں گی اب..؟'' آپا کو مزید غصہ آ گیا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

مٹھو نے لقمہ دیا۔

''او مٹھو..! تم اپنی چونچ بند رکھو، تم پر بھی جگنو کا اثر ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا پنجرہ دو میں اندر رکھ کر آتی ہوں''۔

''ارے آپا ناراض کیوں ہوتی ہو..میں اسے اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیتا ہوں آپ یہاں بیٹھیں۔'' جگنو تمیز سے بولا۔

صبح سویرے پارک میں پہنچ کر بہت مزہ آیا، سب سے زیادہ خوش مٹھو تھا۔ طرح طرح کے پرندے چہچہا رہے تھے اور مٹھو بھی انھیں دیکھ دیکھ کر سیٹیاں بجا رہا تھا اور ان کی نقلیں اتار رہا تھا۔

''بھئی میں ذرا ستا لوں..!'' ابو نے ہری ہری گھاس پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

مٹھو بولا۔

''تُو ہی دیکھ مٹھو! میں تو بہت تھکا ہوا ہوں۔'' مٹھو کے اس بے وقت کے شعر پر ابو نے بے زاری سے کہا تو مٹھو انھیں چھوڑ کر پھولوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

''واہ واہ... کیا خوبصورت پھول ہیں!'' جگنو نے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑنا چاہا۔

''توڑ لینا شاخ سے تجھ کو میرا آئین نہیں!'' مٹھو کی آواز آئی تو جگنو کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

اتنے میں جگنو اور شمع کے درمیان کسی بات پر بحث چھڑ گئی، وہ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

''اچھا چلو مٹھو سے پوچھ لیتے ہیں..!'' جگنو بولا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے..!'' شمع بھی متفق ہوگئی۔

''بتاؤ مٹھو وہ جو سامنے درخت پر بیٹھا ہے وہ کبوتر ہے نا...؟'' جگنو نے مٹھو کی حمایت چاہی۔

''نہیں مٹھو وہ فاختہ ہے نا..؟'' شمع جلدی سے بولی۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

مٹھو بے ساختہ بولا۔

''کیا کہا بدتمیز... تم نے مجھے بکری کہا..؟'' شمع غصے سے بولی اور جگنو ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

''کیا تم بھی عورت ذات کو کمتر سمجھتے ہو مٹھو..؟'' امی نے پوچھا جو ان کی بحث سن کر وہاں آ گئی تھیں۔

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غم ناک
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

''تمھاری نظر میں بھی اس کا حل نہیں ہے کیا..؟'' امی نے پھر پوچھا۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خردمند

''اچھا تو تم خود کو مرد سمجھتے ہو...وہ بھی خردمند..؟'' شمع نے حقارت سے مٹھو کو دیکھا۔

''میں نے نہیں... یہ شعر تو اقبالؒ نے کہا ہے!'' مٹھو نے خود کو بچایا۔

''امی اس سے پوچھیں اس نے مجھے بکری کیوں کہا..؟'' شمع اسی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے تم نے جو یہ مغربی لباس پہن رکھا ہے یہ برا لگا ہے مٹھو کو..!'' جگنو نے بات بنائی۔

''بھئی مجھے جو لباس پسند آیا وہ میں خرید لیا اور پہن لیا...جا کر دکانداروں کو منع کرو کہ وہ ایسے مغربی لباس کیوں سجا کر رکھتے ہیں''۔

شمع نے صفائی پیش کی۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

یہ سن کو شمع کا غصہ دو آتشہ ہو گیا۔

''اس جاہل طوطے سے بحث بے کار ہے، چلیں امی ہم اُدھر گھوم کر آتے ہیں..!'' شمع اُٹھ کھڑی ہوئی اور وہ دونوں اُدھر کو چل پڑیں، آپا نے موقع غنیمت جان کر اپنی کتاب کھول لی اور پڑھنے لگیں۔ جگنو پارک کا چکر لگا کر آیا تو دیکھا مٹھو خاموش بیٹھا ہے۔

''مٹھو اداس کیوں بیٹھے ہو...کون یاد آ رہا ہے؟'' جگنو اس کے پاس بیٹھ گیا۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

''اچھا تو اپنے گھر کے لیے اداس ہو رہے ہو..!'' جگنو بھی افسردگی سے بولا۔

''آپا...او آپا، ہم مٹھو کو آزاد نہ کر دیں، اسے اپنا گھر بہت یاد آ رہا ہے!''۔

''اوہو..! بے وقوف ایسا غضب نہ کرنا، اسے اپنے گھر کا کیا پتہ۔ اسے تو کسی نے انڈے سے نکلتے ہی پروفیسر صاحب کو دے دیا تھا، انھوں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے، دوسرے پرندوں کو دیکھ کر ویسے ہی ڈرامہ کر رہا ہے، اور اب تو اسے اُڑنا بھی نہیں آئے گا باہر نکالا تو مارا جائے گا، بلی کے ہتھے چڑھ جائے گا یا کوّے مار دیں گے۔''

''ہاں! اس کے اوٹ پٹانگ شعر سن کر تو ضرور ہی مار دیں گے''۔ شمع نے بھی طنز کیا۔

''اچھا بھئی! بہت گھوم لیا، بس اب چلنے کی تیاری کرو۔'' ابو بولے۔

''ہاں ویسے بھی اب گرمی بڑھ رہی ہے۔'' امی بولیں تو سب اپنی اپنی چیزیں سمیٹنے لگے۔

* * * *

''پروفیسر صاحب آئے ہیں..!'' ملازم نے آ کر بتایا تو جگنو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''ہیں..! ایک ماہ اتنی جلدی گزر گیا... پندرہ دن میں ہی..؟''۔

''نہیں بھئی ابھی پندرہ دن ہی ہوئے ہیں، لیکن میرا سیمینار ختم ہو گیا تھا اس لیے میں جلدی آ گیا۔'' پروفیسر صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

''السلام علیکم سر کیسے ہیں آپ..؟'' جگنو نے جلدی سے آگے بڑھ کر پروفیسر صاحب سے ہاتھ ملایا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں، یہ بتاؤ میرا مٹھو کیسا ہے..؟''۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مٹھو خفگی سے بولا۔

''ارے... میرا مٹھو بیٹا مجھ سے ناراض ہے کیا..؟'' ایک کونے سے مٹھو کی آواز آئی تو پروفیسر صاحب اُٹھ کر وہاں چلے گئے۔

''لیکن یہ تو میر تقی میر کا شعر تھا..؟'' جگنو حیرت سے بولا

''ہاں اسے تمام شعرا کا کلام یاد ہے لیکن عام طور پر اقبال کو ہی پسند کرتا ہے اور انھیں کے شعر پڑھتا ہے۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''کمال ہے..اسے تمام شعرا کا کلام یاد ہے...ہمیں تو صرف اقبال کے اشعار سن کر حیرت ہوتی تھی..!''۔

''اچھا تو اب میں اسے لے جاؤں..؟'' پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں آپ کی چیز ہے شوق سے لے جائیے۔'' جگنو بولا، ''ویسے پروفیسر صاحب میرا تو مشورہ ہے کہ آپ ایسے بہت سے مٹھو رکھیے اور ہر طالب علم کو ایک ایک بانٹ دیں، ایسا طوطا تو ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ مجھے تو بہت شرمندگی ہے کہ جن شعرا کا کلام ہم طالب علموں کو یاد ہونا چاہیے وہ ایک طوطے کو ازبر ہے، آپا ٹھیک ہم سے ناراض ہوتی ہیں..!''۔

''ہاں بیٹا! ہم علامہ اقبالؒ جیسے عظیم شعرا اور ان کے کلام کو نہیں پڑھتے اسی لیے ہم اپنی مذہبی اور سماجی اقدار کو بھی بھول گئے ہیں اور مغرب کے دلدادہ ہو گئے ہیں..! آپ جیسے بچے خوش قسمت ہیں جو صحیح وقت پر اپنی غلطی کو محسوس کر لیں اور اس سے جان چھڑا لیں۔ اچھا اگر وعدہ کرو کہ تم مٹھو سے کلام اقبالؒ یاد کر لو گے تو میں اسے تمھارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔''

''ہیں پروفیسر صاحب...آپ بہت اچھے ہیں، آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی، کیوں مٹھو سکھاؤ گے مجھے کلام اقبالؒ..؟'' جگنو مٹھو کے پنجرے کے پاس جا کر خوشی سے بولا۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

''آج سے میں جگنو کا مٹھو ہوں..!'' مٹھو بولا تو سب لوگ ہنسنے لگے۔

* * * *

بازگشت

دادا جان نماز پڑھ کر آئے تو قرآن کھول کر بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کر دی۔ شیری، بوبی اور پنکی جو کچھ دن پہلے ہی جرمنی سے آئے تھے اور شوق میں دادا دادی کے کمرے میں ہی سوتے تھے، وہ پھر سے دادا جان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور بولے:

''دادا جان! یہ آپ کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں..؟'' شیری نے پوچھا

''کیا یہ کہانیوں کی کتاب ہے..؟'' بوبی بولا

دادا جان نے بچوں کا ذوق وشوق دیکھا تو تلاوت ختم کی اور ان کو سمجھانے لگے، انھیں حیرت بھی ہوئی کہ بچے قرآن کو نہیں پہچانتے۔

''بیٹا یہ وہ کتاب ہے جس میں دین اور دنیا کی بھلائی چھپی ہے، اسے قرآن کہتے ہیں۔ یہ ہم مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتاری تھی۔ دراصل یہ کتاب اللہ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتاری تھی تا کہ وہ سب مسلمانوں کو پڑھنا سکھائیں۔ جو بھی اس کو پابندی سے پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے وہ جنت میں جاتا ہے۔''

''اچھا اچھا... یہ تو بائبل جیسی کتاب ہے۔'' شیری نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا تو بوبی نے گردن ہلائی، دادا جان ان کے جواب پر دنگ رہ گئے اور افسردہ ہو گئے پھر بھی پیار سے بولے

''ہاں بیٹا! بائبل جیسی ہی کتاب ہے۔ بائبل عیسائیوں کے نبی حضرت عیسیٰؑ پر اتاری گئی تھی اور مسلمانوں کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید اتارا گیا تھا۔''

''پھر تو ہمیں بھی قرآن پاک پڑھنا چاہیے کیونکہ ہم بھی تو مسلمان ہیں نا..!'' شیری بولا جو ان تینوں میں بڑا اور ذرا سمجھدار تھا۔

''شکر ہے بیٹا! کم از کم آپ لوگوں کو یہ تو علم ہے کہ آپ مسلمان ہیں، یہ تو آپ لوگوں کے

امی ابو کا قصور ہے کہ انھوں نے آپ کو ابھی تک کچھ نہیں سکھایا ورنہ آپ کی عمر میں تو بچے قرآن ختم بھی کر لیتے ہیں اور نماز بھی سیکھ لیتے ہیں۔'' دادا جان تاسف سے بولے

''تو ہمیں بھی سکھائیں نا دادا جان..!'' بوبی بولا، ''ممی پاپا کو تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ ہمیں کچھ سکھائیں۔''

''ممی پاپا کو شاید ایسی باتیں آتی ہی نہیں جو دادا جان اور دادی جان کو آتی ہیں۔'' پنکی معصومیت سے بولی جو سب سے چھوٹی تھی

''نہیں بیٹا! آپ کے امی ابو کو سب کچھ آتا ہے، یہ تو برا ہو جرمنی کا جہاں جا کر وہ سب کچھ بھول گئے ہیں۔'' دادا جان بولے۔

''اچھا تو دادا جان آپ ہمیں نماز اور قرآن سکھا دیجیے نا۔ ابھی تو ہم یہاں پر دو ماہ رہیں گے۔'' شیری نے کہا۔

''ہاں بیٹا کیوں نہیں! اللہ نے چاہا تو میں دو ماہ میں تمھیں سب کچھ سکھا دوں گا۔ میں آج ہی تم لوگوں کے لیے سپارے لے آؤں گا۔'' دادا جان خوشی سے بولے، ان کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر آ رہا تھا؛

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

انھیں معلوم تھا کہ بچوں میں ہر نئی بات سیکھنے کا شوق اور جذبہ ہوتا ہے۔ اب یہ بڑوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ انھیں کیا کچھ سکھاتے ہیں۔ دادا جان کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ بچے ایک اچھے کام میں ان کی تقلید کر رہے تھے۔ دراصل بچے وہی کچھ کرتے اور سیکھتے ہیں جو ان کے بڑے کر رہے ہوتے ہیں، جو کام آپ خود نہ کر رہے ہوں اس کو سکھانے کے لیے کچھ بھی کر لیں بچے کبھی نہیں سیکھ پاتے۔

صبح صبح نماز کے بعد بچے بڑے زور و شور سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ شور کی آواز سن کر امی

ابو کی بھی آنکھ کھل گئی۔امی نے فوراً باہر آ کر دیکھا کہ آخر بچے اس وقت کر کیا رہے ہیں۔ان کو قرآن پڑھتا دیکھ کران کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ ناگواری سے بولیں:

''ابّا جان! آپ نے یہ بچوں کو کس طرف لگا دیا..؟''

''ارے بیٹا...بچے قرآن پڑھنا سیکھ رہے ہیں،آپ لوگوں کو تو فرصت نہیں ملتی جاب کی وجہ سے، میں نے سوچا یہ فریضہ میں ہی ادا کر دوں۔'' دادا جان فخر سے بولے۔

''یہ بھلا ان کے کس کام آئے گا..!سکھانا ہی ہے تو جرمن سکھائیں، انگلش یا پھر کمپیوٹر کے نئے پروگرام سکھائیں..!''امی بولیں تو دادا جان نے اقبال کا یہ شعر سنانا بہتر سمجھا؛

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

''اوہو امی..! وہ سب تو ہم سکول میں بھی سیکھ لیتے ہیں،''شیری درمیان میں بولا،''ہم تو دادا جان سے قرآن پڑھنا ہی سیکھیں گے،دیکھیں کتنا مزہ آ رہا ہے۔''

''تم چپ کرو دادا کے چمچے..!''بچوں کی امی کو غصّہ آ گیا،''تمھیں کیا معلوم تمھارے لیے کیا اچھا ہے کیا برا..!''

''بہو ! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو..؟ کیا تمھیں نہیں معلوم قرآن پڑھنا اچھا ہوتا ہے برا..؟'' دادا جان نے خفگی سے کہا

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

''اوہو ابّا جان آپ تو ناراض ہو گئے..! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ یہ سب تو میں نے اور علی نے بھی پڑھا ہوا ہے مگر وہاں یہ ہمارے بھلا کس کام آ رہا ہے،کام تو ہماری ڈگریاں ہی آ رہی ہیں نا...دیکھیں کتنی اچھی جابز ملی ہیں ہمیں۔''

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

دادا جان نے دکھ سے سوچا پھر بولے؛

''ارے شازیہ بیٹا یہ سب آپ کے کام تو تب آئے گا نا جب آپ لوگ اس کو استعمال کرو گے، اس پر عمل کرو گے۔ جس طرح تم لوگ اپنی ڈگریاں استعمال کر رہے ہو اس طرح قرآن کو بھی اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کر کے دیکھو پھر بتاؤ کہ یہ کسی کام کا ہے یا نہیں..! یہ اس لیے تھوڑا ہی ہے کہ زندگی میں ایک بار پڑھ لیا پھر اس کو لپیٹ کر ہمیشہ کے لیے الماری میں رکھ دیا۔ ملک تو چھوڑا ہی تھا مذہبی روایات کو بھی چھوڑ دیا''۔

''نہیں ابا جان اپنے ملک وقوم سے تو ہمیں بڑی محبت ہے، تبھی تو پاکستان آئے ہیں ہم''۔ شازیہ مسکرا کر بولیں۔

''ارے بیٹا،

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی کہاں''

''مگر پھر بھی ابّا جان..!'' شازیہ پھر بولیں، ''میرا مطلب ہے کہ آج کے اس تیز رفتار دور میں تو یہ سب.....!''۔ اتنے میں بچوں کے ابو بھی باہر نکل آئے اور بچوں کی امی کو مزید بولنے سے منع کر کے کمرے میں بھیج دیا، تو دادا جان اپنا غصّہ دباتے ہوئے بولے؛

''سوری ابّا جان! دراصل وہاں کی جدید ترین زندگی نے شازیہ کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا ہے، آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانیے گا! مجھے تو خوشی ہے کہ جو کام ہم نہیں کر سکے وہ آپ کر رہے ہیں۔'' دادا جان کچھ ناراضگی سے بولے؛

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

''میں نے تو یہ فریضہ یہی سوچ کر ادا کیا ہے کہ چلو تم لوگوں کو وقت نہیں ملتا تو میں ہی بچوں کو اس طرف لگا دوں، لیکن مجھے بہو کی بات سے بہت دکھ ہوا ہے۔ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے شاید؛

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی

''میں شازیہ کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں ابّا جان، میں اس کو سمجھاؤں گا۔''
علی نے ایک بار پھر معذرت کی تو دادا بولے

''دیکھو علی بیٹا! تم نے ٹریننگ پر جرمنی جانے کی اجازت مانگی میں نے دے دی، پھر تم نے وہاں جاب کر لی اور بیوی بچوں کو بھی وہیں بلا لیا اور وہیں کے ہو رہے ہم پھر بھی چپ رہے، مگر اب تم لوگ بچوں کی تربیت میں کوتاہی کرو گے تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے...!

کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تُو
حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار

اور پھر...... یہ سب میں اپنے لیے تو نہیں کر رہا ہوں، بچوں کی تربیت اچھی ہوگی تو کل کو تمھیں ہی فائدہ ہوگا، ورنہ اگر انھوں نے بھی اس معاشرے کی تقلید شروع کر دی تو تم ان کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گے۔ دینی تعلیم بچوں کو بڑوں کا ادب اور لحاظ سکھاتی ہے۔

''جی ابّا جان میں سمجھ رہا ہوں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' علی نے سر جھکا کر ابّا جان کی تائید کی۔

''تمھیں یاد ہے... جب تم میٹرک میں تھے تو علامہ اقبالؒ کے کس شعر پر تم نے دھواں دھار تقریر کی تھی اور انعام کے حقدار بنے تھے؟'' علی نے ذہن پر زور دیا لیکن یاد نہ آیا تو دادا جان نے انھیں شعر سنایا؛

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''اوہ ہاں، آپ نے خوب یاد دلایا، اس وقت مجھے یہ شعر بہت پسند تھا۔''

''لیکن کافروں کے دیس میں جا کر دین سے وفا کی سب باتیں بھول گئے نا بیٹا، کیا میں

نے تمھیں یہی تعلیم دی تھی..؟''

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو
پھر پسر قابل میراثِ پدر کیونکر ہو

علی شرمندگی سے سر جھکا کر بیٹھے رہے

* * * *

رات ہوتے ہی بچے دادا جان کے گرد جمع ہو کر کہانی سننے کی فرمائش کرنے لگے۔

''بھئی ابھی تو عشاء کا وقت ہو گیا ہے، پہلے نماز پڑھیں گے پھر کھانا کھائیں گے،اس کے بعد کہانی سنائیں گے۔'' دادا جان بولے

تو بچے بھی دادا جان کے ساتھ مسجد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

''دادا جان مسلمان کس کی عبادت کرتے ہیں..؟'' بوبی نے گھر آ کر پوچھا

''بیٹا سب مسلمان ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔'' دادا جان نے جواب دیا

''لیکن دادا جان ہم نے تو مسجد میں کسی اللہ کا بت نہیں دیکھا...پھر کیسے عبادت ہوتی ہے..؟'' بوبی نے پریشان ہو کر پوچھا

''دراصل دادا جان یہ اس لیے پوچھ رہا ہے کہ جب ہم چرچ جاتے ہیں تو وہاں کرائسٹ کا بت ہوتا ہے،میری کا بت ہوتا ہے اور سب لوگ اس کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔'' شیری نے دادا جان کو سمجھایا

''تو کیا تم لوگ وہاں چرچ جاتے ہو..؟'' دادا جان نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا

''کبھی کبھی دادا جان،دراصل وہاں پاپا کے بہت سے کرسچن دوست ہیں تو ہمیں بھی کرسمس اور ایسٹر پر لے جاتے ہیں۔'' شیری نے وضاحت کی تو دادا جان نے تاسف سے سوچا؛

ان کو تہذیب سے ہر بند نے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

''اور رادھا آنٹی کے گھر میں بھی تو بت ہے..!'' بوبی کو یاد آیا

''یہ رادھا آنٹی کون ہیں..؟'' داداجان نے پوچھا

''وہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں، ان کے بچے ہمارے دوست ہیں، بوبی اور پنکی تو زیادہ تر انھیں کے گھر رہتے ہیں۔''

''ماشااللہ! بھانت بھانت کے مذاہب سے تم لوگ واقف ہو چکے ہو،نہیں معلوم تو اسلام کے بارے میں ہی نہیں معلوم!'' داداجان غصّے سے بولے،''تو کیا تمھارے ماں باپ کے کوئی مسلمان دوست نہیں جو تمھیں مسجد بھی لے جاتے..؟''

''ہاں داداجان مسلمان دوست بھی ہیں۔'' شیری نے بتایا،''لیکن وہاں کوئی مسجد نہیں ہے۔''

''پھر بتایئے نا داداجان...مسجد میں بت کیوں نہیں ہے..؟'' بوبی نے اصرار کیا

''دیکھو بیٹا! میری بات غور سے سننا اور اچھی طرح یاد رکھنا،آئندہ آپ لوگوں نے چرچ نہیں جانا۔اور جو رادھا آنٹی ہیں ان کے گھر بے شک جاؤ لیکن ان کے عبادت خانے میں نہیں جانا۔'' داداجان نے سمجھایا،''دیکھو بوبی بیٹا بتوں کی پوجا صرف کافر کیا کرتے ہیں، ہم مسلمان ہیں اور اسلام اللہ تعالی کا سب سے پسندیدہ مذہب ہے۔اللہ تعالیٰ صرف نور ہے اس کی کوئی شکل نہیں ہے جس کا ہم بت بنالیں، جس طرح سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ہر جگہ پھیل جاتی ہے اور اس روشنی میں ہر چیز صاف اور واضح نظر آتی ہے،ہم اس روشنی کو نہ ہی قید کر سکتے ہیں نہ ہی اس کی کوئی تصویر بنا سکتے ہیں،اسی طرح اللہ تعالی بھی نور ہے اور روشنی ہے جو ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے اس لیے ہم اس کا بت نہیں بنا سکتے۔آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ بت بنانا اور ان کی پوجا کرنا سخت گناہ ہے۔اللہ تعالی ہر گناہ کو معاف کر سکتے ہیں لیکن شِرک کبھی معاف نہیں کرتے ،یعنی اللہ تعالی کی عبادت کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنا ایسا گناہ ہے جس کی کوئی معافی نہیں ہے،اور شرک کرنے والا کبھی جنت میں نہیں جا سکتا۔''

''لیکن داداجان ہمارے رابرٹ انکل تو بہت نیک ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں جائیں گے۔'' شیری بولا

''بیٹا نیک لوگ تو ہر قوم اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں، لیکن ان کی مذہبی کتابوں میں بھی یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ مذہب اسلام ہے اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں اور جو کوئی ان پر ایمان لائے گا وہی جنت میں جائے گا۔ وہ لوگ بجائے اپنا عقیدہ درست کرنے کے مسلمانوں کو بھی غلط راستے پر لگا رہے ہیں۔''

ابراہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

دادا جان سوچ کر لرز رہے تھے کہ یہ ان کی اولاد کس طرف جا رہی ہے، پھر بچوں کی طرف متوجہ ہوئے،

''اب سمجھ آیا بوبی بیٹا کہ ہم بت کیوں نہیں بناتے..!''

''جی دادا جان بالکل سمجھ آ گیا۔'' بوبی نے زور سے گردن ہلا کر کہا۔

اتنے میں پنکی روتی ہوئی آئی اور دادی جان سے لپٹ کر بولی:

''دادی جان کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں..؟''

''ارے.. کیوں نہیں بیٹا! تم تو میری جان ہو۔'' دادی جان اس کو لپٹاتے ہوئے بولیں

''تو پھر آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں میں ممی پاپا کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ممی ہمارا خیال بھی نہیں رکھتیں الٹا ہمیں ڈانٹتی رہتی ہیں۔''

پنکی روتے ہوئے بولی

''پنکی بیٹا آپ نے ضرور امی کو تنگ کیا ہوگا تبھی انھوں نے ڈانٹا ہے۔ دیکھو بیٹا بچوں کو شیطان اکساتا ہے کہ وہ شرارت کریں اور ان کو ڈانٹ پڑے، پھر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ جس کام سے امی پاپا نے منع کیا ہو تو شیطان چپکے سے بچوں کے کان میں آ کر کہتا ہے کہ یہ کام بڑا اچھا ہے ضرور کرو، پھر امی پاپا پریشان ہوتے ہیں اور بچوں کو مار پڑتی ہے، تب شیطان خوشی سے تالیاں بجاتا ہے۔ اس لیے میرا بیٹا جس کام سے امی پاپا منع کریں وہ کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کی امی کو بھی سمجھاؤں گی کہ میری پیاری بیٹی کو نہ ڈانٹا کریں۔'' دادا جان نے سمجھایا۔

''ابّا جان انھیں بھی تو سمجھائیں کہ مجھے تنگ نہ کیا کریں۔ یہاں آ کر تو بالکل ہی بگڑ گئے ہیں، سب بھول گئے ہیں کہ میں انھیں کیا کیا سمجھا کر لائی تھی۔'' امی بچوں کو غصّے سے گھورتے ہوئے بولیں تو دادی جان نے کہا؛

نہ ہو یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

''جاؤ بچو آپ ذرا باہر جاؤ، ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔'' دادا جان بولے۔ بچے چلے گئے تو دادا جان شازیہ سے مخاطب ہوئے؛

''دیکھو بیٹا! بچوں کو تو میں سمجھا دوں گا، لیکن تم بھی ایک بات سمجھ لو..! انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ تم نے اتنا بڑے اور تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ بھلا دیا، اپنا مذہب، رہن سہن، اپنے بڑوں کی سکھائی تہذیب... سب کچھ چند سالوں میں ہی بھلا دیا تو پھر وہ تو معصوم بچے ہیں ان سے کیسی شکایت کہ جو تم سمجھا کر لائی تھیں انھوں نے دادا دادی کی محبت میں سب بھلا دیا..! بات بات پر ان کو ڈانٹا اور پیٹا مت کرو، تعلیم یافتہ مہذب لوگ ایسا نہیں کرتے۔ بچے تو کنویں کی مانند ہوتے ہیں، کنویں میں منہ ڈال کر جو بات کہو گے وہی واپس سنائی دے گی، بچے ہماری ہی بازگشت ہوتے ہیں۔''

شازیہ نے یہ سن کر شرمندہ ہوتے ہوئے سر جھکا لیا

''سوری ابّا جان! آئندہ میں ان باتوں کا خیال رکھوں گی اور بچوں کی تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا''۔

''جیتی رہو بیٹی! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' دادا جان نے خوشی سے شازیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نماز کے لیے چل دیے۔

* * * *

ہمت

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

رات کے گیارہ بج رہے تھے،احمد اپنے چھوٹے سے گھر کے برآمدے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔وہ میٹرک کا طالب علم تھا،گرمی ہو یا سردی اس کا یہی معمول تھا کہ جب گھر کے سب افراد سونے کے لیے لیٹ جاتے تو وہ اپنی کتابیں اٹھا کر باہر آجاتا،چونکہ رات کے اس پہر بہت خاموشی ہوتی ہے اس لیے وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ پوری توجہ اپنی پڑھائی کو دے سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسے پڑھائی کا وقت بھی کہاں ملتا تھا..!صبح صبح نماز سے فارغ ہوکر وہ اخبار کی ایجنسی چلا جاتا تھا،وہاں سے اخبار لے کر گھر گھر بانٹتا،پھر گھر آکر ناشتہ کرتا اور سکول چلا جاتا،سکول سے آکر کھانا کھاتا اور سیدھا کتابوں کی ایک دکان پر چلا جاتا جہاں وہ سیلز بوائے تھا،وہاں سے رات دس بجے لوٹتا تو گھر والے سونے کی تیاری کر رہے ہوتے تھے،تب وہ اپنی کتابیں اٹھا کر برآمدے میں آجاتا تاکہ باقی لوگوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

یہ سب احمد کو اس لیے کرنا پڑتا تھا کہ اس کے ابو فوت ہو چکے تھے اور وہ اپنی امی اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کا واحد کفیل تھا۔امی کو اس پر بہت ترس بھی آتا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس پر کتنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے،لیکن وہ اس کو کسی کام سے منع بھی نہیں کرسکتی تھیں کہ اگر وہ نوکری چھوڑ دیتا تو گھر کیسے چلتا اور ان سب کی پڑھائی کیسے چلتی،اور اگر وہ پڑھائی چھوڑ دیتا تو ان سب کی آنکھوں میں جو سہانے خواب احمد کے مستقبل سے جڑے تھے وہ ٹوٹ جاتے۔احمد لائق بھی بہت تھا ہمیشہ اول آتا تھا،اس طرح نہ صرف گھر والوں کی بلکہ اساتذہ کی امیدیں بھی احمد سے وابستہ تھیں۔ایسے ہی بچے دیارِ عشق میں اپنا نام اور مقام بناتے ہیں۔

احمد کے ابو کی اچانک وفات کے صدمے سے امی بھی بیمار ہوگئی تھیں اس لیے گھر چلانے کے لیے وہ کوئی کام نہیں کرسکتی تھیں، اس بات کا انھیں بہت افسوس ہوتا تھا لیکن وہ احمد کی کامیابی کے لیے سارا دن دعائیں کرتی تھیں اور اس کا حوصلہ بڑھاتی تھیں کہ ایک دن اس کی محنت رنگ لائے گی اور ہم بھی اچھے دن دیکھیں گے۔ ماں باپ کی دعائیں اور حوصلہ افزائی احمد جیسے محنتی بچوں کے لیے ایندھن کا کام کرتی ہیں جس سے ان کی ہمت کی گاڑی زندگی کے مشکل راستوں پر باآسانی دوڑتی رہتی ہے اور ایک دن وہ منزل مقصود کو پا لیتے ہیں۔ احمد کی امی اس کو اکثر حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر سناتی تھیں؛

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں
اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے

احمد خود بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی

آج بھی ایک سرد رات تھی بارہ بجے کا وقت ہوگا، احمد کوئلوں کی ایک چھوٹی سی انگیٹھی کے قریب چادر لپیٹے ہوئے برآمدے میں بیٹھا حسبِ معمول پڑھائی میں غرق تھا، میٹرک کے امتحانات سر پر تھے۔ گلی میں اچانک شور اُٹھا، سرد راتوں میں تو ویسے بھی اتنی خاموشی ہوتی ہے کہ آواز بہت دور تک اور واضح سنائی دیتی ہے۔ احمد نے سنا بہت سے لوگ ''چور چور'' کا شور مچا رہے تھے۔ احمد کو بہت حیرت ہوئی کہ غریبوں کے اس محلے میں چور کیا کرنے آ گیا! یہ دیکھنے کے لیے اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا ایک لڑکا تیزی سے بھاگتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا جس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں پستول تھا، احمد سمجھ گیا کہ یہی چور ہے، لیکن اس کا پیچھا کرنے والے ابھی پچھلی گلی میں تھے اور جب تک وہ یہاں پہنچتے چور نہ جانے کہاں نکل چکا ہوتا۔ احمد ایک اچھا ایتھلیٹ بھی تھا اور دوڑ کے مقابلے بھی ہمیشہ وہی جیتا کرتا تھا، لہٰذا اس نے لمحوں میں ہی فیصلہ کرلیا کہ اس نے چور کو پکڑنا ہے۔ وہ چور کے پیچھے بھاگا اور منٹوں میں ہی چور کا

جالیا، چور یہ ناگہانی آفت دیکھ کر گھبرا گیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، ایک گولی احمد کو لگی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اپنی چادر اتار کر چور کے اوپر پھینکی اور اس کے گرد لپیٹ دی، اس کا پستول بھی ہاتھ سے گر گیا۔ احمد کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ چور حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے میں باقی لوگ بھی پہنچ گئے اور چور کو قابو کر لیا۔ احمد زخمی ہونے کی وجہ سے گر کر بے ہوش ہو گیا، اس کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔

صبح محلے کے سب لوگ مل کر احمد کو دیکھنے گئے تو اس کو ہوش آ چکا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی جو آپریشن کے بعد نکالی جا چکی تھی۔ اس کی امی اس کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کے لیے تو بیٹے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا، اور یہ بھی کہ اب تو وہ امتحان ہی نہیں دے سکے گا ایک الگ دکھ تھا۔

’’بہن شکر کرو تمھارے بیٹے کی جان بچ گئی۔‘‘ ایک محلے دار نے سمجھایا

’’اور پھر اس نے چور کو پکڑ کر بہت بڑا کارنامہ کیا ہے۔‘‘ دوسرا پڑوسی بولا

ان ہی لوگوں میں وہ شخص بھی تھا جس کی چوری ہوئی تھی، وہ ایک بنک میں کیشیئر تھا اور بنک کا کافی کیش اس کے پاس تھا جو اسے صبح بنک میں جمع کرانا تھا، چور بھی محلے کا ہی ایک لڑکا تھا جو جانتا تھا کہ اس کے پاس بریف کیس میں خاصی رقم موجود ہے۔ اگر چور وقت پر پکڑا نہ جاتا تو اس بے چارے کیشیئر کی نوکری بھی جاتی اور وہ لاکھوں روپے اسے اپنی جیب سے بھرنے پڑتے جو ظاہر ہے کہ اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس طرح کیشیئر تو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گیا تھا لیکن احمد کی امی کو اپنی دنیا اندھیرا اور اپنے بیٹے کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ کیشیئر کی سفارش پر بنک والوں نے احمد کو کچھ رقم انعام کے طور پر تو دے دی تھی لیکن زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ اب احمد امتحان کیسے دے پائے گا جس کے لیے وہ دن رات محنت کر رہا تھا۔

اسی دوران میٹرک کے امتحانات بھی شروع ہو گئے تھے، جس دن پہلا پیپر تھا اس دن احمد کے تمام ہم جماعتوں کو افسوس تھا کہ احمد امتحان میں نہ بیٹھ سکے گا۔ پیپر شروع ہونے ہی والا تھا کہ امتحان ہال کے باہر کھٹ کھٹ کی آواز نے سب کی توجہ دروازے کی جانب مبذول

کروادی۔ سب نے دیکھا کہ احمد بے ساکھی کے سہارے چلتا ہوا امتحان ہال میں داخل ہوا۔ احمد کے سب دوست خوشی سے کھڑے ہوگئے، کچھ تو بھاگ کر اس سے لپٹ گئے، امتحان ہال میں ایک عجیب جذباتی منظر تھا ممتحن بھی حیران تھے کہ یہ لڑکا اس حالت میں بھی امتحان دینے چلا آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ احمد بے حد لائق طالب علم تھا اور روز کا کام روز کرنے کا عادی تھا اس لیے اس کی تیاری پوری تھی اور وہ امتحان دینے کے لیے پُر جوش تھا کیونکہ وہ اپنا سال ضایع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب لوگ اس کو وہاں دیکھ کر بہت خوش تھے، سچ تو یہ ہے کہ تمام طالب علموں کے حوصلے احمد کو دیکھ کر بلند ہوگئے تھے اور وہ بڑے جوش وخروش سے پیپر دے رہے تھے۔ وہ نکمے طالب علم جو سارا سال کچھ نہیں کرتے تھے اور امتحان کے دنوں میں طرح طرح کے بہانے تراشتے تھے کہ پیپر اچھے نہ ہونے کا جواز پیش کرسکیں آج وہ بھی احمد کو اس حالت میں پیپر دیتا دیکھ کر شرمندہ ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

اسی طرح خوشی خوشی تمام پیپرز ختم ہوگئے اساتذہ اور طالب علموں نے احمد کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ احمد تو پہلے ہی ہر دل عزیز تھا اب تو سکول کا ہیرو بن گیا تھا، ہر طرف اس کی ہمت اور بہادری کے چرچے تھے۔

سکول میں بہت گہما گہمی تھی کیونکہ آج 14 اگست تھا اور یومِ پاکستان کا جشن منایا جا رہا تھا، تمام طالب علم بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ احمد بھی ایک اچھا مقرر تھا اور ہر تقریری مقابلے میں حصّہ لیا کرتا تھا، لیکن ابھی اس کی ٹانگ کا زخم ٹھیک نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر نے اس کو ہم نصابی سرگرمیوں میں حصّہ لینے سے منع کیا تھا، لیکن آج اس کی جگہ ایک نیا طالب علم تقریر کرنے آ رہا تھا۔ جب وہ لڑکا سٹیج پر آیا تو سب اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے.... کیونکہ یہ وہی چور لڑکا تھا جس کی وجہ سے احمد اس حالت کو پہنچا تھا۔ یہ لڑکا کبھی احمد کا ہی ہم جماعت تھا لیکن آٹھویں میں تھا تبھی سکول چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ وہ سٹیج پر شرمندہ شرمندہ سا آیا اور تقریر شروع کی۔

''جناب صدر! محترم اساتذہ اور عزیز طالب علم ساتھیو۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ پاکستان یا چودہ اگست کے حوالے سے کچھ کہہ سکوں کیونکہ میں ایک چور ہوں اور سکول سے بھاگا

ہوا ایک نکما طالب علم ہوں، لیکن جو چیز مجھے دوبارہ اس سکول میں لائی ہے وہ ہے احمد کی ہمت اور بہادری، جو اتنی کم عمری میں اپنے گھر کا واحد کفیل اور سہارا ہے...اس کے باوجود اس نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی اور اپنے محلے کے غریب لوگوں کی مدد کرنے کی ٹھانی، اور زخمی ہونے کے باوجود ایک چور کو پکڑ لیا جس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول بھی تھا، اور وہ بزدل چور ایک زخمی اور نہتے لڑکے سے خود کو چھڑا بھی نہیں سکا۔

میں سمجھتا تھا کہ پڑھنا بہت مشکل کام ہے اور چوری کرنا نہایت آسان ..! لیکن احمد کی وجہ سے ہی مجھے اس حقیقت کا علم ہوا کہ چوری کرنے کے لیے بھی ہمت اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اس چوری کے جرم میں تین ماہ کی سزا اور جرمانہ ہوا تھا جو بہت معمولی تھا کیونکہ میں نا بالغ چور تھا اس لیے مجھے سزا میں بھی رعایت دی گئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بچوں کو قدم قدم پر کتنی رعایات ملتی ہیں مگر بچے ہیں کہ عقل نہیں پکڑتے، ہر جگہ اپنے والدین اور اساتذہ کو شرمندہ کراتے ہیں اور اپنے بچہ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

مجھے یہاں حضرت علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو انھوں نے شاید مجھ جیسے نکموں کے لیے ہی لکھا ہوگا؛

مل نہیں سکتی نکموں کو زمانے میں مراد
کامیابی کی جو خواہش ہو تو محنت چاہیے
ہے اسی میں بھید عزت کا اگر سمجھے کوئی
چھوٹے بچوں کو بزرگوں کی اطاعت چاہیے

آج میں آپ کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہوں کیونکہ آئندہ میں اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں پرنسپل صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے احمد کی سفارش پر مجھے دوبارہ سکول میں داخلہ دے دیا، اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنے والدین اور اساتذہ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا، اب مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہے کہ جو لوگ ہمت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی انھیں کی مدد کرتا ہے۔ جناب صدر، میں اپنی تقریر شاعر مشرق علامہ

اقبال کے اس شعر کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو انھوں نے احمد جیسے باہمت اور باکمال نوجوانوں کے لیے ہی کہا ہے:

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اور اس کے ساتھ ہی سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

* * * *

دو دوست

سمجھتا ہے تُو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

(سیارہ زہرہ سے ایک بگولے کی زمین پر آمد کی کہانی)

ایک گاؤں میں دو دوست سلو اور شوکی رہتے تھے۔ ان دونوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے اور زمینیں بھی۔ وہ میٹرک پاس تھے اور اسکول بھی ہمیشہ ساتھ جاتے تھے۔ نام تو ان کے سلیمان اور شوکت تھے لیکن شاید یہ گاؤں والوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب تک نام بگاڑ نہ لیں انھیں نام لینے کا مزہ ہی نہیں آتا۔ وہ اتنے گہرے دوست تھے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنے گھر پر اکیلا نظر نہیں آتا تھا بلکہ دونوں جہاں بھی ہوتے تھے ساتھ ہی موجود ہوتے تھے۔ ان دونوں کے گھر والے بھی ان کی اس عادت سے تنگ تھے، بہت سمجھاتے تھے کہ بھئی کبھی اپنے اپنے گھروں پر بھی رہا کرو ..... نتیجہ وہی نکلتا جسے بھینس کے آگے بین بجانا کہتے ہیں۔

وہ دونوں میٹرک پاس تھے پھر بھی نوکری کرنے کی بجائے انھوں نے اپنے آبائی پیشے کو اپنایا تھا، وہ کھیتی باڑی کیا کرتے تھے اور روزانہ اپنی زمینوں پر بھی اکٹھے ہی جاتے تھے۔ اگر ایک کو کوئی کام ہوتا تو وہ صرف ایک کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ دونوں ہی اس کام کے لیے جاتے تھے۔ اسی طرح اگر ایک بیمار ہوتا تھا تو دوسرا بھی اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگتا تھا اور وہ بھی چھٹی کر کے دوست کی تیمار داری میں لگ جاتا، اور پھر دونوں کے کام کا ہرج ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا جس سے اب وہ جان نہیں چھڑا سکتے تھے۔

مگر جب وہ دونوں کام کرنے پر آتے تھے تو پھر بہت محنت سے کام کرتے تھے اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ حالانکہ دونوں کے کھیت بھی ساتھ ساتھ

تھے اور وہ جاتے بھی ساتھ ہی تھے لیکن جب وہ کام میں جُت جاتے تو پھر اُنہیں ایک دوسرے کی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ جب وہ کام میں مصروف رہتے ایک دوسرے سے بالکل بے خبر رہتے تھے شاید یہی ان کی اچھی کارکردگی کا راز تھا کیونکہ اگر کام کے وقت بھی اُنہیں ایک دوسرے کی فکر رہتی تو کام کیسے کرتے۔ اس لیے ان کے دور دور تک لہلہاتے ہرے بھرے کھیت سب سے اچھے تھے اور سب سے زیادہ فصل دیتے تھے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر پھیلے یہ کھیت بہت بھلے معلوم دیتے تھے۔

اسی طرح ایک دن وہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک سلو کے کھیت میں آگ کا ایک گولا آ کر پڑا۔ سلو یہ دیکھ کر بہت حیران اور پریشان ہوا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا اس کے کھیت کو آگ کیسے لگ گئی اور کہاں سے لگ گئی جبکہ دور دور تک تو کوئی بھی نہیں تھا اور جب وہ آگ کا گولا سلو کی طرف بڑھنے لگا تو وہ دوڑ پڑا۔

''رُک جاؤ بھائی ..... ڈرو نہیں۔''

سلو اپنے پیچھے سے یہ الفاظ سن کر رک گیا، وہ سمجھا شاید کوئی اس کی مدد کو آ گیا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ آگ کا گولا اس کے سر پر آن پہنچا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً چھ فٹ اونچا بگولا بن گیا تھا۔ اب تو بھاگنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

''مجھ سے ڈرو نہیں ..... میں تو تم سے ملنے آیا ہوں۔'' آگ کا وہ بگولا بولا۔

''کون ہو تم؟ ..... کہاں ہو تم؟ اور یہ آگ بھی میرے کھیت میں تم نے ہی لگائی ہے کیا؟'' سلو پریشانی سے بولا، ''ٹھہرو پہلے میں یہ آگ بجھا لوں پھر تم سے بات کرتا ہوں۔'' سلو پانی لانے کے لیے ٹیوب ویل کی طرف بڑھا۔

''ارے دوست یہ غضب نہیں کرنا ورنہ میں مر جاؤں گا۔ میں آگ کا بنا ہوا ہوں مجھ پر پانی مت ڈالنا۔'' سلو نے غور کیا تو یہ آواز آگ کے بگولے سے آ رہی تھی، ''تمھارے کھیتوں میں پہلے ہی پانی ڈلا ہوا تھا اس لیے بچت ہو گئی ورنہ شاید آگ لگ بھی جاتی۔''

''کون ہو تم ..... اور ..... اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' سلو کی گھگھی بندھ گئی، وہ اسے کوئی

جن بھوت سمجھ رہا تھا کیونکہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جن بھوت ہی آگ کے بنے ہوتے ہیں۔

''بھئی! ..... گھبراؤ نہیں میں تمھارا پڑوسی ہوں۔'' آگ کا بگولا بولا۔

''میرا پڑوسی ..... ؟ یعنی فضلو چاچا ..... ؟ جن کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا ..... ؟'' سلو مشکوک نظروں سے بگولے کو دیکھتے ہوئے بولا، ''مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ تم کوئی بھوت ہو ..... یعنی تم فضلو چاچا کا بھوت ہو .....! کیا تم مرنے کے بعد شیطانوں میں شامل کر دیے گئے ہو فضلو چاچا ..... بظاہر تو بڑے نیک دکھائی دیتے تھے۔''

''اوہو..... بھئی میں وہ والا پڑوسی نہیں ہوں، میں تو اُدھر سیارہ زہرہ سے آیا ہو۔'' بگولے نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

''کیا کہا ..... ؟ زہرہ سے؟ یعنی تم دوسرے سیارے کی مخلوق ہو ..... ؟ مگر تم تو صرف ایک بگولا ہو ..... ؟ تمھاری شکل کیسی ہے ..... اپنی اصلی شکل دکھاؤ نا .....! ایسی شکل کی کون سی مخلوق ہوتی ہے ..... ؟ سلو مزید خوفزدہ ہوتے ہوئے بگولے سے اور پیچھے ہٹ گیا۔

''تم تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے میں زہرہ سے نہیں بلکہ چڑیا گھر سے آیا ہوں۔'' بگولا سلو کی حیرانی پر ناراض ہوتے ہوئے بولا، ''اور ہماری شکل بس ایسی ہی ہوتی ہے، ہم بگولے جو ہوئے۔''

''مگر تم ..... اتنی آسانی سے زمین پر کیسے پہنچ گئے ..... ؟ اور ایسے بتا رہے ہو جیسے ساتھ والے گاؤں سے آئے ہو۔'' سلو بولا۔

''ہاں تو ..... ؟ یہ تو رہا ہمارا سیارہ زہرہ، تمھاری زمین کے بالکل اوپر۔ شام کو اکثر تم لوگ ہمارے سیارے کی طرف بڑے شوق سے دیکھ رہے ہوتے ہو۔ کبھی اسے صبح کا تارا تو کبھی شام کا تارا کہہ رہے ہوتے ہو، کبھی اسے چاند کے ساتھ جوڑ کر اس پر شعر کہہ رہے ہوتے ہو۔ افسوس ہمارے سیارے کا کوئی چاند نہیں ہے۔ اس لیے جب ہمارا سیارہ گردش کرتا ہوا تمھارے چاند کے بہت نزدیک چلا جاتا ہے تو ہماری عید ہو جاتی ہے، ہم بگولے جوق در جوق اس کی سیر کو جاتے ہیں اور اس کی ٹھنڈی سفید روشنی میں نہاتے ہیں، یعنی ''مون باتھ'' لیتے ہیں جس سے ہماری آگ کچھ کم ہو جاتی ہے ورنہ ہمارے سیارے پر تو آگ برستی ہے۔ جس طرح تمھاری زمین پر بارش

برستی ہے، ہمارے زہرہ پر شہابیے برستے ہیں جس سے جگہ جگہ آگ بھی لگی رہتی ہے اور گڑھے بھی پڑ جاتے ہیں، خیر ہمارے لیے تو وہ آگ آکسیجن کا کام کرتی ہے۔ مگر میں تو سب سے زیادہ چاند پر ہی جانا پسند کرتا ہوں شاید اسی لیے میری آگ کافی ٹھنڈی ہوگئی ہے۔''

''لیکن، تمھیں ڈر نہیں لگا کبھی اپنی زمین سے نکل کر دوسرے سیارے پر آتے جاتے؟'' سلو نے تو کبھی ایسی باتیں سنی بھی نہیں تھی

''ہاں، کچھ ڈر تو محسوس ہوا تھا پہلی بار جب میں شوق سفر میں آکر تنہا نکل کھڑا ہوا تھا؛

تھا تخیل جو ہم سفر میرا
آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا تھا، اور نہ تھا کوئی
جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے
راز سر بستہ تھا سفر میرا
حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا!''

''واہ! تم تو بہت کمال کی چیز ہو''۔ سلو جو پہلے ہی حیران پریشان تھا اس کی باتیں سن کر مزید حیران ہوا۔

''ہم بگولے تو اکثر تمھاری زمین کی سیر کو بھی آتے رہتے ہیں۔ ہمیں تمھاری یہ ہری بھری سرسبز زمین اور جنگلات بہت پسند ہیں مگر ہم جب بھی زمین پر اترتے ہیں تو اکثر جنگلات میں آگ لگ جاتی ہے تب ہمیں بڑا افسوس ہوتا ہے کیونکہ آگ بجھانے کے لیے بڑی بڑی گاڑیوں میں پانی لایا جاتا ہے اور آگ کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے ساتھی بگولے بھی بجھ جاتے ہیں لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے کیونکہ زیادہ تر تو آگ بجھانے والے بہت دیر سے پہنچتے ہیں اور ہم بڑے آرام سے گھوم پھر کر واپس بھی چلے جاتے ہیں۔ البتہ تمھارے جنگل ہماری وجہ سے تباہ ہو جاتے

ہیں۔اس کا ہمیں بہت افسوس ہوتا ہے، ویسے تو تم انسان خود بھی اس کام میں ماہر ہو۔ وہ تو شکر ہے کہ تم نے اپنے کھیت میں پانی دیا ہوا ہے ورنہ اس کی بھی آج خیر نہیں تھی۔''

''لیکن تمھیں اس طرح آتے جاتے پہلے تو کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا، ورنہ اخبار یا ٹی وی پر خبر ضرور آتی۔'' سلو مسلسل پریشان تھا۔

''ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش...! پہلے ہم آبادی کی طرف کبھی نہیں آئے نا، ہم تو پہاڑوں پر اُترتے ہیں جہاں جنگل اور سبزہ زیادہ ہو، ہم نے تمھاری دنیا کے سارے پہاڑی علاقے دیکھ رکھے ہیں وہ ہمیں کئی ہزار فٹ نزدیک بھی پڑتے ہیں۔آج ہمارا ذرا لانگ ڈرائیو کا ارادہ تھا اس لیے میدانی علاقوں کی طرف نکل آئے۔ مجھے تمھارا یہ لہلہاتا کھیت پسند آیا تو میں یہاں آ گیا اور میرے ساتھی آگے نکل گئے۔''

''شکر ہے ..... وہ سب یہاں نہیں آئے ورنہ تو ہمارے سارے گاؤں کو ہی آگ لگ جاتی۔'' سلو بولا، اسے یقین پھر بھی نہیں آ رہا تھا۔

''میں نے اپنے کورس کی کتاب میں پڑھا تھا نظام شمسی کے بارے میں، اس میں تو لکھا تھا کہ یہ سیارے ہماری دنیا سے لاکھوں کروڑوں میل دور ہیں، تم لوگ اتنی آسانی سے کیسے آ جاتے ہو ؟'' سلو نے ذہن پر زور ڈالا پھر مشکوک انداز میں بولا،'' سچ بتاؤ کہیں تم پرانی مسجد کے پیچھے برگد کے درخت پر رہنے والے جن بھائی تو نہیں ہو....؟ پہلے جب لوگ اس کا ذکر کرتے تھے تو مجھے اور شوکی کو یقین نہیں آتا تھا، مگر اب پکا یقین ہو گیا ہے۔لیکن تمھیں مجھ سے کیا کام ہے وہ بھی دن دہاڑے .....؟''

''بڑے افسوس کی بات ہے .....!'' بگولا ناراض ہوتے ہوئے بولا،'' میں نے تمھیں اتنی ساری باتیں بتائیں تمھیں کسی پر یقین نہیں آیا .....؟ مجھے تو تمھارے کھیتوں کی طرح تم بھی بہت پسند آئے تھے ..... اور میں تم سے دوستی کرنے کے لیے رک گیا تھا ..... ورنہ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا چکا ہوتا ..... ایک تم ہو کہ مجھے ابھی تک جن ہی سمجھے ہوئے ہو۔ کیا تمھارے یہ جن ہمارے سیارے کی خبر لا سکتے ہیں .....؟ اور ہم آگ کے بنے ہوئے ہیں .....

ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے بجلی کی رفتار سے سفر کرتے ہیں اس لیے چند گھنٹوں میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پہنچ جاتے ہیں، مشکل تو تم انسانوں کو ہوتی ہے۔''

اس بگولے کا واسطہ پہلی بار کسی انسان سے پڑا تھا ..... اسے اندازہ نہیں تھا کہ انسان کتنے شکی مزاج ہوتے ہیں وہ تو جنوں کو بھی زچ کر دیے ہیں، اس بے چارے بگولے کی بات پر اتنی آسانی سے کیسے یقین کر سکتے ہیں۔

''اچھا اچھا ..... بگولے بھائی ناراض نہ ہو۔ دراصل پہلے کبھی تمھارے بارے میں نہ ہم نے سنا نہ دیکھا اس لیے غلط فہمی ہوگئی، کیونکہ اب تو کیبل سسٹم کی وجہ سے ذرا سی خبر بھی منٹوں سیکنڈوں میں دنیا کے دوسرے سِرے تک پہنچ جاتی ہے۔ اور دنیا تو ایک معمولی سی چیز ہے ہم تو اس دیہات میں بیٹھ کر بھی پوری کائنات کی خبریں روزانہ سنتے ہیں۔ سب پتہ ہے کہ کس سیارے پر کیا ہو رہا ہے۔ سیارہ زہرہ کے بارے میں تو ابھی تک یہی پتا چلا تھا کہ چونکہ وہاں کا درجہ حرارت اتنا زیادہ ہے (459 ڈگری سینٹی گریڈ) کہ اگر وہاں پانی ہوگا بھی تو وہ بھاپ بن کر اُڑ گیا ہوگا اس لیے وہاں پر زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور تمھاری طرح کی مخلوق تو ہمارے یہاں صرف جنات ہی پائے جاتے ہیں جو آگ کے بنے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر شیاطین ہوتے ہیں۔ لیکن اب پتہ چلا کہ زہرہ پر بھی انسان ہوتے ہیں .....!''

''انسان نہیں ..... بگولے، ہم بگولے ہیں۔'' بگولے نے اس کی تصحیح کی۔

''اچھا اچھا ..... بگوے ہی سہی۔'' سلو بولا۔ ''لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک سائنسدانوں کو اس بات کا علم کیوں نہیں ہو سکا کہ زہرہ پر بھی ایک مخلوق آباد ہے۔ اگر میں یہ بات میڈیا کو بتا دوں تو راتوں رات مشہور سائنسدان بن جاؤں گا کہ میں نے زہرہ کی مخلوق دریافت کر لی ہے۔''

''ہرگز نہیں! تم یہ کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ ورنہ ہماری دوستی ختم ہو جائے گی۔'' بگولا پریشان ہو کر بولا، اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دیہاتی ایسی بات بھی کر سکتا ہے۔ ''تمھاری دنیا کی خلائی گاڑیاں اکثر ہمارے سیارے کے اردگرد گھومتی ہی رہتی ہیں اور کئی ایک تو سیارے کے اوپر آ کر

تصویریں بھی لے چکی ہیں مگر ہم اُنہیں کہیں نظر آ ئیں تو اُنہیں پتا چلے کہ اس سیارے پر ہم بستے ہیں، ہم تو اُنہیں دیکھتے ہی چُھپ جاتے ہیں اور اگر تصویر میں آ بھی جائیں تو آگ کے بگولے کے سوا اُنہیں دکھائی ہی کیا دے گا۔ وہ بیوقوف تو اپنے جیسی انسانی مخلوق کی ہی کھوج میں نکلتے ہیں سائنسدان جو ٹھہرے ....جو ہر شے کو دوربین اور خوردبین کی آنکھ سے دیکھتے ہیں یا پھر کیمرے کی آنکھ پر بھروسا کرتے ہیں، ان کے پاس وہ نظر نہیں جو ہم جیسی مخلوق کو دیکھ سکیں۔''
بگولے نے کافی سمجھداری کی بات کی تھی۔

''ہوں ..... صحیح کہہ رہے ہو،تمھاری اس بات پر مجھے بھی میر تقی میر کا ایک شعر یاد آ گیا، .....!''

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ، ہر جا جہانِ دیگر تھا

''واہ وا ..... کیا شعر پڑھا ہے، بالکل صحیح کہا۔ یہی حال تمھارے سائنسدانوں کا ہے، ظاہری آنکھ سے ہر چیز دیکھتے ہیں، ذرا غور کریں تو اُنہیں ہر سیارے کی مخلوق نظر آ جائے۔'' بگولا بولا۔

''واہ بھئی! تم تو بڑے ذہین بگولے ہو، تمھیں تو شعروں سے بھی دلچسپی ہے .... پڑھے لکھے لگتے ہو جو ہر بات شاعرانہ انداز میں کر رہے ہو، کتنے پڑھے ہوئے ہو؟ اور سب سے اہم بات تو میں نے پوچھی ہی نہیں .....! تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام ''ملیخا سزایو'' ہے اور ہمارے یہاں پڑھائی وڑھائی نہیں ہوتی، ہمیں ویسے ہی ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔'' بگولا لاپرواہی سے بولا۔

''بغیر کتابیں پڑھے تمھیں ہر بات کا کیسے پتہ ہوتا ہے .....! ہمیں تو سیکڑوں کتابیں پڑھ کر اور ساری عمر گزار کر بھی عقل نہیں آتی۔''

''دراصل انسان فطرتاً ہی ایسا ہے کہ ارتقائی مراحل دیر سے طے کرتا ہے، چاہے وہ جسمانی ہوں یا ذہنی، کیونکہ مٹی کا بنا ہوتا ہے اس لیے عمر بھی لمبی ہوتی ہے۔ جبکہ ہم بگولے آگ کے بنے ہوتے ہیں اس لیے روشنی اور ہوا کی رفتار سے ہر کام کرتے ہیں اور بہت جلدی تمام مراحل طے کر کے ختم بھی جلدی ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا اچھا ..... سمجھ گیا۔لیکن تمھارا نام بڑا عجیب سا ہے ''ملیخا سزایو'...! یہ کیا نام ہوا..؟ پہلے کبھی سنا نہیں .....!'' سلو نے پوچھا۔

''تم نے جب میرے جیسا بگولا پہلے کبھی نہیں دیکھا تو پھر میرے جیسا نام کیسے سن سکتے ہو .....؟ ویسے تو مجھے بھی تمھارا نام عجیب لگتا ہے مگر ہم بگولے تم انسانوں کی طرح بلا وجہ دوسروں پر تنقید کر کے اپنا وقت ضایع نہیں کرتے ..... ہمیں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔''

''ہاں ہاں..... تمھیں تو گھومنے پھرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی .....! زندگی کو اور انسانوں کو سمجھنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔'' سلو نے بھی طنز کیا۔

''اچھا .....! مگر علامہ اقبال نے تو کہا تھا کہ؛

سمجھتا ہے تُو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

''بہت خوب، تمھیں تو اقبال کے شعر بھی یاد ہیں..! یہ تم نے کہاں سنے؟'' سلو پر ایک اور انکشاف ہوا۔

''اقبال کا ہی شعر اقبال کے لیے عرض ہے؛

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

میں نے تو پہلے بھی اقبال کے شعر پڑھے، لیکن شاید وہ تم نے نہیں سنے تھے۔ دراصل جب میں نے اقبال کے اشعار سنیں تو ان کے بارے میں مزید جاننے کی جستجو شروع ہوگئی، پھر میں نے دنیا کا رُخ کیا اور یہاں سے بہت کچھ جاننے کو ملا۔ آرٹسٹ اور فنکار لوگ ساری کائنات کے سانجھے ہوتے ہیں،'' ملیخا بولا، ''وہ خیالات جو کسی آرٹسٹ یا کسی بھی فلاسفر کے ذہن میں آتے ہیں وہ کائنات میں آزادانہ گھوم رہے ہوتے ہیں، جو مخلوق بھی اپنے دماغ کی کھڑکی کھول کر بیٹھی ہو اس کے دماغ میں چلے جاتے ہیں، ایسے میں جو اچھی باتیں سوچ رہا ہوتا ہے اس کے ذہن میں اچھے خیالات چلے جاتے ہیں اور جو بُری باتیں سوچ رہا ہوتا ہے اس کے ذہن میں بُرے اور

غلط قسم کے خیالات چلے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی بہت اچھے شاعر ہیں مگر اقبال کی تو بات ہی کچھ اور ہے ..... اقبال ایک کائناتی شاعر ہیں ..... وہ تمام کائنات اور نظامِ شمسی تک کے بارے میں سوچتے تھے، ہمارے سیارے زہرہ کے بارے میں بھی انھوں نے شعر کہے ہیں۔ اسی لیے ہمیں بھی وہ بہت پسند ہیں''۔

''واہ ..... کیا زبردست بات کہی ہے! اسی لیے بڑے کہتے ہیں کہ ہر وقت اپنے دل اور دماغ کو صاف رکھو تا کہ اچھے خیالات ہی آئیں۔ ویسے تم بہت خوش قسمت ہو دوست کہ جس بات کو جاننے کی جستجو ہو اس کے لیے دوسری دنیاؤں کا بھی سفر کر لیتے ہو، ہم دنیا والے تو اپنے گاؤں سے بھی بمشکل ہی نکلتے ہیں۔'' سلو نے افسوس سے کہا

''اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے سامنے زماں و مکاں اور بھی ہیں''

بگولے نے اقبال کا ایک اور شعر پڑھا۔

''واہ وا.... تمھیں تو لگتا ہے کہ اقبال کا پورا کلام یاد ہے! مجھے تو شرمندگی ہو رہی ہے کہ شاعر وہ ہمارے ہیں اور یاد تمھیں ہیں''۔ سلو کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی

''نہیں، یہ تم نے غلط کہا کہ اقبال صرف تمھارے شاعر ہیں، وہ ایک کائناتی شاعر ہیں اور ان پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی بھی سیارے کی مخلوق کا ہو سکتا ہے، اور پھر جو شاعر پسند ہو ہم اس کا پورا کلام یاد کر لیتے ہیں، اور یہ سنو! ہم بگولوں کے لیے اقبال نے کیا خوب شعر کہا ہے...!

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

''واہ کمال ہے! مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ اقبال نے یہ شعر تم بگولوں کے لیے کہا ہے۔ لیکن تمھیں اتنے طویل طویل سفر کر کے دیگر سیاروں اور ستاروں کی خاک چھاننے کی ضرورت کیا ہے؟''

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نقطہ تاروں کی زندگی میں

مگر تم دنیا والے ستاروں کے سربستہ راز کیسے جان سکتے ہو جب تک اپنی اس زمین کی قید سے باہر نہ نکلو۔'' بگولا بولا۔

''تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو، میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ تمھارے بارے میں ساری دنیا کو بتا دوں، سب کو تم سے مل کر بڑی حیرت انگیز خوشی ہوگی۔'' سلو بولا۔

''بالکل نہیں، میں ابھی کچھ دن اور جینا چاہتا ہوں، تم انسان تو مجھے عین جوانی میں ہی بجھا دو گے،'' ملیجا بولا، ''ہم لاکھ ذہین سہی مگر تم انسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تم لوگ چالاک بہت ہوتے ہو۔ جاہل سے جاہل آدمی بھی اپنے مطلب کی بات فوراً سمجھ جاتا ہے۔''

''اچھا کسی کو نہیں بتاؤں گا ..... لیکن اپنے دوست شوکی کو تو بتا دوں ..... وہ کسی میں شامل نہیں ہے، وہ اور میں ایک ہی ہیں اور اسے ذہین لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔''

''نہیں نہیں کسی کو بھی نہیں بتانا .....! میں نے تم سے مل کر بھی غلطی کی، تم انسان تو بڑے خطرناک ہوتے ہو۔ میں بے چارہ آگ بگولا تو صرف ایک بالٹی پانی کی مار ہوں۔ میری ماں پہلے ہی کہتی تھی انسان کے سامنے کبھی مت جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔ اب اندازہ ہوا کہ مائیں ہمیشہ صحیح کہتی ہیں، مگر ہمیں اکثر تب سمجھ آتا ہے جب بہت دیر ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھی بھی نہ جانے کہاں چلے گئے اور کب واپس آئیں گے؟'' ملیجا بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

''ارے بگولا بھائی، میرا مطلب ہے ملیجا بھائی تم پریشان نہ ہو ہم انسان اتنے بُرے بھی نہیں ہوتے جتنا تم سمجھنے لگے ہو، تم نے ابھی انسان دیکھے ہی کہاں ہیں۔ اگر تم ہم سے دوستی کرنے آئے ہو تو ہم بھی دوستی نبھانا خوب جانتے ہیں۔ جب تک تمھارے ساتھی نہ آئیں تم یہاں آرام سے رہ سکتے ہو۔''

''سلو ..... سلو یار کہاں ہو .....؟ اتنا ٹائم ہو گیا اور میں وہاں تمھارا انتظار کر رہا ہوں، سلو کہاں ہو .....؟'' شوکی وہیں سے آوازیں دیتا ہوا آ رہا تھا

ملیجا نے جو ایک اور انسان کی آواز سنی تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا یہ انسان تو مجھے ضرور مار دے گا، اسے گھبراہٹ میں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ جلدی سے سلو کے قالب میں گھس گیا۔

’’ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو .....؟ میں جل جاؤں گا۔‘‘ سلو پریشان ہو کر بولا۔

’’جب دوست کہا ہے تو چھپنے کی جگہ بھی تو دو ..... اس سے بہتر اور کیا جگہ ہو سکتی ہے۔ فکر نہ کرو تم جلو گے نہیں کیونکہ میری آگ کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اب میں یہاں آرام سے رہ سکوں گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چل سکے گا ..... اور اگر تم بتانا بھی چاہو تو نہیں بتا سکو گے کہ میں کون ہوں۔‘‘

ملیخا سلو کے جسم میں گھس کر مطمئن ہو گیا اور سلو کی روح اس کے قالب سے نکل کر باہر کھڑی ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ انسان کی روح آگ کے ساتھ تو نہیں رہ سکتی تھی۔

’’تم باہر کیوں نکل گئے ..... چاہو تو تم بھی میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ بقول تمھارے شیطان بھی تو آگ کا بنا ہوا ہوتا ہے اس کے ساتھ تو تم بڑے آرام سے رہتے ہو۔ جو نہ صرف تمھارے جسم بلکہ دل دماغ پر بھی قبضہ جمائے رہتا ہے اسے تو تم کچھ نہیں کہتے۔‘‘ ملیخا نے کہا۔

اتنے میں شوکی سر پر پہنچ چکا تھا۔

’’سلو یار کیا ہوا ہے .....؟ اتنے پریشان کھڑے ہو! خیر تو ہے .....؟ میں اتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں تم نے کسی کا جواب بھی نہیں دیا۔ شام ہو گئی ہے گھر نہیں چلنا .....؟‘‘

شوکی نے سلو کا کندھا ہلایا جو حیران ہکا بکا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے چونکہ وہ سلو نہیں بلکہ ملیخا تھا۔

’’یہ دوستی مجھے بڑی مہنگی پڑی .....!‘‘ یہ آواز سلو کی بجائے سائڈ سے آئی تھی، کیونکہ سلو کی روح تو سائڈ میں کھڑی تھی۔

’’سلو.....! تم تو اب بغیر منہ کھولے ہی بولنے لگے ہو، تمھیں کیا ہو گیا ہے یار، اور یہ تم نے کیا کہا کہ تمھیں دوستی مہنگی پڑی .....؟ میں نے تو تمھیں کچھ بھی نہیں کہا۔ مجھ سے اگر کوئی شکایت ہے تو کھل کر کہو .....! شوکی بھی پریشان ہو گیا۔

’’نہیں ..... یہ میں تمھیں نہیں کہہ رہا تم تو میرے بہت اچھے دوست ہو۔‘‘ سلو جلدی سے بولا۔

’’پھر .....! پھر کس کو کہہ رہے ہو؟ کیا میرے علاوہ بھی اس دنیا میں تمھارا کوئی دوست ہے ...؟ یہاں کوئی اور بھی ہے کیا ..؟‘‘ شوکی بے یقینی سے بولا۔

’’نہیں .....!اس دنیا میں تو نہیں ..... لیکن .....!‘‘

’’کُھوں کُھوں .....!‘‘ملیخا زور سے کھانسا، اور سلو جو راز فاش کرنے لگا تھا وہ ایک دم چپ کر گیا۔

’’کیا بات ہے ..... سلو تم ایک دم چپ کیوں کر گئے کچھ کہنے لگے تھے .....؟ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کھانس کیوں رہے ہو .....؟ شوکی کو آج سلو کی باتیں عجیب لگ رہی تھیں،

’’چلو جلدی سے گھر چلتے ہیں مجھے تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔‘‘ شوکی سلو کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا جواب ملیخا تھا پھر گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

’’سلو ..... یار اتنا گرم ہاتھ .....!تم تو بخار سے پُھنک رہے ہو، اتنا زیادہ بخار تو تمھیں زندگی میں کبھی نہیں ہوا، یہ اچانک کیا ہوا ہے..؟ صبح تو بالکل ٹھیک تھے ... آج بہت زیادہ کام کر لیا کیا ..؟ چلو پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔‘‘

’’نہیں نہیں ..... میں بالکل ٹھیک ہوں،‘‘ ملیخا گھبرا کر شوکی سے دور ہو کر بولا، ’’آج گرمی شاید کچھ زیادہ تھی گھر چل کر نہالوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔‘‘

’’کیا .....؟ سلو یہ سردیاں ہیں ....!تمھیں تو ویسے بھی سردی بہت لگتی ہے اور تم نہانے کی بات کر رہے ہو ...! مجھے تو لگتا ہے کہ بخار تمھارے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ چلو پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں اور دیر ہوگئی تو کچھ کا کچھ بن جائے گا‘‘۔شوکی نے یہ کہہ کر پھر ملیخا کا ہاتھ پکڑ لیا، اسے اپنے دوست کی بہت فکر ہو چلی تھی اور سلو ساتھ کھڑا سب تماشا دیکھ رہا تھا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

’’کہہ دیا نا ..... میں بالکل ٹھیک ہوں،‘‘ملیخا شوکی سے ہاتھ چھڑاتا ہوا بولا، ’’میری فکر چھوڑو تم گھر جاؤ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔‘‘ شوکی سلو کی یہ بے رُخی دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور سلو تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

’’بے وقوف انسان ..... یہ تم نے کیا حرکت کی .....؟‘‘ تھوڑی دور جا کر سلو ملیخا پر برس پڑا۔

’’انسان نہیں بگولا ہوں میں .....‘‘ملیخا نے اس کی تصحیح کی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے ..... تم جو بھی ہو مگر تم نے یہ بہت گھٹیا حرکت کی ہے۔تم نہیں جانتے کہ صرف وہی میرا ایک دوست ہے ساری دنیا میں، اسے ناراض کر کے تم نے اچھا نہیں کیا، اب وہ مجھ سے کبھی بات نہیں کرے گا۔'' سلو کو بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

''اچھا وہی تمھارا ایک دوست ہے .....؟ اور میں کیا ہوں .....!''ملیخا خفا ہو کر بولا

''پتا نہیں .....! تم ایک بگولے ہو اور انسانی جذبات کو نہیں سمجھ سکتے میں تو تمھیں دوست کہہ کر پچھتایا۔تم نہیں جانتے ہم دونوں کی بچپن سے لے کر اب تک کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی اور اب تمھاری وجہ سے .....'' سلو سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر اب وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تو صرف ہوا تھا۔

''چلو ..... اب میری وجہ سے تم نے یہ مزہ بھی چکھ لیا،''ملیخا بولا،'' دیکھو سلو پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ تمھارا ایسا ہی دوست ہے تو وہ کبھی تم سے ناراض نہیں ہوگا بلکہ تمھاری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، اور دوسری بات یہ ہے کہ بار بار ایک ہی دوست کا ذکر کر کے تم میرا دل نہیں دکھاؤ ..... آخر اب میں بھی تو تمھارا دوست ہوں اور پھر اپنی اس چھوٹی سی ددنیا سے باہر بھی دیکھو، اس کے باہر بھی دوست بناؤ آخر میں نے بھی اپنی دنیا سے باہر آ کر تمھیں دوست بنایا ہے۔''

''دوست..؟ ہونہہ! اچھے دوست ہو، دوست کے جسم پر ہی قبضہ کر لیا..! سلو ابھی تک ناراض تھا۔

''بھئی ناراض کیوں ہوتے ہو، میں نے کون سا یہاں ساری عمر رہنا ہے ..... ایک آدھ دن میں چلا ہی جاؤں گا۔کیا تم اپنے دوست کو ایک دن بھی اپنے جسم میں ٹھہرنے نہیں دے سکتے .....؟''

سلو ذرا شرمندہ ہو گیا اور چپ کر کے چلنے لگا، اس کا گھر بھی آ گیا تھا۔اس نے ملیخا کو اشارے سے اپنے گھر کا راستہ بتایا اور وہ دونوں گھر میں چلے گئے۔سلو کی اصل مشکل تو اب شروع ہوئی تھی کیونکہ ملیخا تو اس کے گھر میں کسی کو پہچانتا ہی نہیں تھا اب کس سے بات کرے اور کیا کرے اور ان سے پہلے شوکی آ کر سلو کی شکایت کر کے جا چکا تھا جس پر اس کے گھر والے بھی حیران بیٹھے تھے کہ کیا آج سورج مغرب سے نکلا تھا جو اتنا انوکھا واقعہ پیش آ گیا کہ سلو اور شوکی

کی ناراضگی ہوگئی۔سلو نے ملیخا کے کان میں کچھ کہا اور وہ سلو کی ماں سے بولا؛

''ماں جی ..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ..... میں اپنے کمرے میں سونے جا رہا ہوں۔''

''مگر ..... بیٹا صبح سے بھوکے ہو کھانا تو کھا کر جاؤ۔'' ماں جی پیار سے بولیں تو ملیخا وہیں رک گیا اور شوق سے بولا؛

''ماں جی ..... یہ کھانا کیا ہوتا ہے .....؟''

سب ایک دوسرے کو حیرت سے اور سلو کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔شوکی نے بتایا تھا کہ سلو کو تیز بخار ہے جو اس کے دماغ کو چڑھ گیا اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، اس لیے ماں جی پھر پیار سے بولیں؛

''وہ دیکھو بیٹا ..... وہ جو تمھارے ابا جی کھا رہے ہیں نا اسی کو کھانا کہتے ہیں۔'' اور ابا جی کے ہاتھ کھانا کھاتے کھاتے وہیں رک گئے۔

''مگر ..... ماں جی وہ تو میں نے کبھی نہیں کھایا۔'' ملیخا حیرت سے بولا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا اب کھا لو''۔ ماں جی پیار سے بولیں

''نہیں..... مجھے بھوک نہیں ہے، میں کمرے میں جا رہا ہوں۔'' ملیخا کی بجائے سلو بولا اور جلدی سے کمرے کی طرف جانے لگا۔اسے واقعی کھانے کی حاجت نہ تھی کیونکہ وہ تو اب صرف روح تھا اور ملیخا بھی ہماری طرح کا کھانا تو نہیں کھاتا تھا اس لیے اس سے پہلے کہ ملیخا کوئی اور حماقت کرے وہ جلد از جلد اپنے کمرے میں چلے جانا چاہتا تھا۔

''اچھا بیٹا ..... پھر گرم گرم شہد ملا دودھ ہی پی لو وہ تو تمھیں بڑا پسند ہے۔'' ماں جی شہد کی مٹھاس لہجے میں لا کر بولیں تو ملیخا پھر رک گیا اس بار اس نے انکار نہیں کیا۔اس نے سوچا پی کر تو دیکھوں آخر ماں جی اتنے پیار سے دے رہی ہیں، پھر گرم دھواں اُٹھتا ہوا دودھ دیکھ کر بولا؛

''ماں جی ..... گرم نہیں ٹھنڈا ٹھنڈا دیں ..... مجھے ٹھنڈی چیزیں بہت پسند ہیں .....''

''مگر بیٹا ..... پہلے تو تمھیں ٹھنڈی چیزوں سے ٹھنڈ لگ جاتی تھی اب کیسے پیو گے جبکہ

تمھیں بخار بھی ہے .....؟''

''پہلے کی بات چھوڑیں ماں جی ..... پہلے میں نالائق تھا اور مجھے کوئی بخار وخار بھی نہیں ہے اس شوکی کا تو دماغ چل گیا ہے''، وہ ماں جی کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ابا جی نے بھی وہیں سے اشارہ کیا کہ جو کہتا ہے وہی کرو۔

''گلابو ..... او گلابو ..... بیٹا ادھر آ ذرا بھائی کو یہ دودھ ٹھنڈا کر کے دے۔'' ماں جی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بیٹی کو آواز دی جو اندر کسی کام میں مصروف تھی۔ گلابو نے آ کر ماں سے دودھ کا کٹورا لیا اور دوسرے برتن میں ڈال کر ٹھنڈا کرنے لگی۔ ملیخا اسے بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا، اسے تو اس دنیا کا سبزہ اور پھول پھلواریاں ویسے ہی بہت پسند تھیں، وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کے تو انسان بھی پھول پھلواریوں سے کم نہیں ہیں۔

''یہ تم اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو .....؟'' سلو نے اس کے کان میں کہا، اسے تو پہلے ہی ملیخا کر حرکتوں پر غصہ آ رہا تھا۔

''کون میں .....!'' ملیخا چونک کر بولا، ''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمھاری بہن کتنی اچھی ہے .....!'' ملیخا کی بات سن کر سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے .....؟ تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ پھر بولا؛ ''نہیں میرا مطلب ہے کہ میری ..... بہن ..... گلابو کتنی اچھی ہے .....! میرے لیے اپنا کام چھوڑ کر آئی ہے .....!''

''مگر بھائی .....! پہلے تو تم نے کبھی میری تعریف نہیں کی بلکہ میرے ہر کام میں کیڑے نکالتے تھے، لگتا ہے تمھاری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے، ڈاکٹر چاچا کو بلانا ہی پڑے گا.....!'' گلابو کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

''نہیں گلابو ..... بہن، ڈاکٹر چاچا کو مت بلانا، آج سے میں روز اسی طرح تمھاری تعریفیں کیا کروں گا،'' گلابو مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی ٹھنڈے دودھ کا کٹورا تھما کر پھر اندر چلی گئی۔ ملیخا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

''جلدی ٹھوسو یہ دودھ اور اندر چلو۔'' سلو پھر غصے سے اس کے کان میں بولا تو ملیخا نے

بغیر سوچے سمجھے دودھ کا کٹورا منہ سے لگا لیا اور غٹا غٹ پینے لگا۔ پورا پی کر اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا پیا ہے،

''ماں جی ..... یہ تو بہت اچھی چیز تھی مجھے تو ٹھنڈ پڑ گئی، ایک اور پلا دیں۔''

''ہاں ہاں ..... میرا بیٹا دس بار پیو ..... او گلابو ..... ادھر آ بھائی کو ایک کٹورا دودھ اور ٹھنڈا کر کے دے ..... اوہو ..... پھر اندر چلی گئی ..... نہ جانے وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے .....! ''ماں جی اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''رہنے دیں ماں جی ..... رہنے دیں گلابو کو ..... ہم خود اندر چلے جاتے ہیں۔'' کیونکہ سلو اسے مسلسل گھور رہا تھا اس لیے ملیخا بھی اُٹھ گیا اور گلابو کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اُدھر نہیں اِدھر چلو وہ ماں جی کا کمرہ ہے میرا کمرہ اس طرف ہے۔

وہ دونوں سلو کے کمرے میں چلے گئے۔ سلو بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا اور ملیخا کمرے میں موجود واحد چارپائی پر لیٹ گیا اور انگڑائیاں لینے لگا۔ یہ بھی اس کے لیے نیا تجربہ تھا کیونکہ وہ جسم تو سلو کا تھا جو سارا دن کا تھکا ہارا تھا لہٰذا لیٹتے ہی اسے نیند آنے لگی، وہ بولا؛

''یار سلو ..... تمھیں کیا پریشانی ہے تم بھی لیٹ جاؤ نا۔ مگر تم کہاں لیٹو گے .....؟ یہاں تو ایک ہی چارپائی ہے، شاید تم اسی لیے پریشان ہو ..... کوئی بات نہیں تم بھی میرے ساتھ لیٹا جاؤ، ویسے بھی تمھیں کون سی زیادہ جگہ چاہیے اب تو تم ہوّا ہو اُس کھونٹی سے لٹک کر بھی سو سکتے ہو۔'' ملیخا کو اس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔

''تمھیں مذاق سوجھ رہا ہے .....؟ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ابا جی ڈاکٹر صاحب کو لے آئے تو کیا ہوگا۔ تمھاری حرکتیں دیکھ کر تو سب کو پکا پکا یقین ہو گیا ہوگا کہ واقعی بخار میرے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔'' سلو کو ملیخا کے اطمینان سے چڑ ہو رہی تھی۔

''اوہو اگر ڈاکٹر صاحب آ بھی گئے تو کیا ہو جائے گا .....؟ آنے دو .....!'' ملیخا پھر اطمینان سے بولا۔

''ہاں ..... آنے دو ..... جب وہ تمھیں تھرمامیٹر لگا کر بخار چیک کریں گے تو تپش سے

ان کا تھرمامیٹر پھٹ جائے گا اور تو کچھ نہیں ہوگا ..... ؟ پھر وہ تمھیں بخار کا ٹیکہ لگائیں گے اور درد کی کڑوی کڑوی گولیاں کھلائیں گے نا تو تمھارا یہ سب مذاق نکل جائے گا اور طرح طرح کے سوال الگ پوچھیں گے۔''

سلو سخت پریشان تھا اور ملیخا کو اسے دیکھ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا: '' بے وقوف انسان ..... ! ایک تو تم انسان بھی خواہ مخواہ کی ٹینشن لے لے کر اچھی بھلی زندگی اجیرن کر لیتے ہو اور اپنی لمبی زندگی کو آدھا کر لیتے ہو۔ ہم بگولوں کو دیکھو اتنی تھوڑی سی زندگی ملتی ہے پھر بھی ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں اگر تم انسانوں جتنی لمبی زندگی ہمیں ملتی تو پتا نہیں ہم کتنی اور دنیائیں تلاش کر لیتے۔ خدا کا شکر نہیں کرتے..... ناشکرے کہیں کے۔''

'' اچھا تو ٹھیک ہے پھر میری ٹینشن کم کرو اور بتاؤ کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے تو تم کیا کرو گے ..... ؟'' سلو ذرا شرمندہ ہو کر بولا۔

'' میں کچھ بھی نہیں کروں گا ..... ! کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہیں آ سکتے وہ آج شہر گئے ہوئے ہیں۔'' ملیخا بولا۔

'' تمھیں کیسے پتا چلا ..... ؟ سلو حیرت سے اچھل پڑا۔

'' تھوڑی دیر پہلے ابا جی کو کسی نے آ کر بتایا تھا، تمھیں تو غصے میں کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔''

'' اوہ واقعی....؟ یار ملیخا تم نے تو میری بہت بڑی پریشانی ختم کر دی۔ اب یہ بھی بتا دو کہ جب صبح شوکی اور اس کے گھر والے میری تیمارداری کو آئیں گے تب ہم کیا کریں گے ...؟'' سلو نے خوش ہو کر پوچھا۔

'' تم نے مجھے یار کہہ کر خوش کر دیا ..... ! اس کا مطلب ہے کہ اب تم مجھے بھی اپنا دوست سمجھنے لگے ہو، فی الحال اتنا ہی کافی ہے صبح کی فکر صبح کریں گے اب سو جاؤ مجھے بہت نیند آ رہی ہے، ویسے بھی مجھے شوکی بالکل پسند نہیں میں اس کے بارے میں سوچ کر اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا۔'' ملیخا اطمینان سے سلو کا لحاف اوڑھ کر سو گیا۔

سلو کمرے سے باہر نکل آیا دوسرے کمرے میں گیا، دیکھا ابا جی، ماں جی اور گلابو سبھی سو چکے تھے۔ ابا جی کے لحاف کا ایک کونہ ہٹا ہوا تھا، اسی کونے سے لحاف کے اندر گھس کر سلو بھی ابا جی کے ساتھ ہی سو گیا، اُنہیں احساس بھی نہ ہوا۔

صبح اچانک اذان کی آواز سن کر ملیخا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تو پہلی بار یہ آواز سنی تھی کیونکہ کسی انسانی بستی میں آنے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا، اسے یہ آواز بہت بھلی لگی اور بیٹھ کر غور سے سننے لگا۔ اذان ختم ہوئی تو اسے سلو کا خیال آیا، اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا کہیں نظر نہ آیا۔ باہر کچھ کھٹکا ہوا تو اس نے سوچا شاید باہر ہو، اس لیے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر دیکھا تو ماں جی نماز کی تیاری کر رہی تھی اور گلابو ماں جی کو وضو کرا رہی تھی لیکن سلو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ سلو صبح بہت دیر سے اُٹھتا ہے۔ جب کام پر جانے کا وقت ہوتا ہے تب ماں جی زبردستی اُٹھاتی ہیں، اور روز ابا جی سے نماز نہ پڑھنے پر ڈانٹ کھاتا ہے۔

''ارے سلو بیٹا .....! کیا رات کو نیند نہیں آئی .....؟'' ماں جی ملیخا کو دیکھ کر حیرت سے بولیں کیونکہ سلو اپنی زندگی میں کبھی اتنی صبح نہیں اُٹھا تھا اور ماں جی کی حسرت تھی کہ وہ کبھی اُٹھ کر صبح کی نماز پڑھے۔ ملیخا کو احساس ہوا کہ اس نے باہر آ کر غلطی کی۔

''سلو بھائی .....! طبیعت کیسی ہے .....؟ گلابو نے پاس آ کر پوچھا،'' ضرور بھوک لگی ہوگی آپ نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا .....!''

''نن...نہیں.....! بالکل نہیں۔'' ملیخا نے بوکھلا کر جواب دیا

''تو پھر صبح صبح کیا نماز پڑھنے کے لیے اُٹھے ہو .....؟ جائے نماز لا کر دوں۔'' گلابو طنزیہ مسکرائی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور حماقت سرزد ہو ملیخا واپس کمرے میں چلا گیا۔ باتوں کی آواز سن کر سلو کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ جلدی سے اُٹھ کر ملیخا کے کمرے میں گیا۔

''کیا ہوا تھا .....؟'' سلو نے پھر پریشان ہو کر پوچھا

''کچھ نہیں .....! تم کہاں تھے .....؟'' ملیخا بولا،'' میں تو تمھیں دیکھنے کے لیے باہر گیا تھا، مگر تم نظر نہیں آئے اس لیے میں واپس آ گیا۔''

''تمھیں کس نے کہا تھا اس وقت باہر نکلنے کو .....؟'' سلو غصے سے بولا۔

''کیوں .....! وقت کو کیا ہوا .....؟ اتنا سہانا وقت ہے مجھے تو چاند کی سرزمین یاد آ گئی۔ میرا تو باہر جا کر گھومنے کو دل چاہ رہا تھا مگر تمھارے بغیر نکل جاتا تو تم اور ناراض ہوتے اس لیے واپس آ گیا۔

''سہانے وقت کے بچے .....! شکر کرو ابا جی نہیں ملے وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں، ورنہ تمھیں سلو سمجھ کر نماز پڑھوا رہے ہوتے اور تم حسب عادت یہ کہہ کر کہ ''نماز کیا ہوتی ہے؟'' ان کے غصے کو دعوت دیتے اور وہ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے۔''

''اچھا تم سے تو پوچھ سکتا ہوں .....! نماز کیا ہوتی ہے .....؟ اور تھوڑی دیر پہلے بڑی تیز آواز آ رہی تھی جس سے میری آنکھ کھلی تھی وہ کس کی تھی .....؟''

''نماز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور عبادت کرنے کو کہتے ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہ اذان کی آواز تھی جو ہمیں نماز کی طرف بلانے کے لیے دی جاتی ہے .....'' سلو نے تفصیل سے بتایا۔

''ہوں .....! خدا کی حمد و ثنا تو ہم بھی کرتے ہیں لیکن دوسرے طریقے سے۔ کیا تم مسلمان نہیں ہو .....؟'' ملیخا نے سوال کیا

''کیوں .....!'' سلو نے حیرانی سے پوچھا۔

''سارا گھر نماز پڑھ رہا ہے ..... تم کیوں نہیں پڑھ رہے .....؟''

''نماز کے بچے ..... زیادہ باتیں نہیں بناؤ اور دوبارہ سو جاؤ ابھی صبح ہونے میں بہت وقت ہے۔''

''میں تو اب نہیں سوؤں گا، پہلے ہی بہت سو لیا......کئی دن کی نیند لے لی۔ ہم بگولے اتنا زیادہ نہیں سوتے۔ مجھے بھوک لگی ہے باہر جا کر کچھ کھاؤں پیوں گا۔ پہلے بھی گلابو کھانے کا پوچھ رہی تھی۔ اس کے بعد باہر جا کر سیر کروں گا تم نے چلنا ہے تو چلو ورنہ میں گلابو کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔'' ملیخا اطمینان سے بولا تو سلو اسے غصے سے گھور کر رہ گیا اور اُٹھ کر اس کے ساتھ باہر چل پڑا۔

باہر آ کر اُنھوں نے دیکھا ابھی تو ماں جی چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھیں اور گلابو پانی بھرنے کنویں پر گئی ہوئی تھی، لہٰذا سوچا کہ پہلے سیر کر لی جائے۔ ملیخا نے ماں جی کو بتایا کہ وہ باہر سیر کے لیے جا رہا ہے، پھر وہ دونوں گھر سے باہر نکل گئے۔ ماں جی حیرانی سے سلو کو باہر جاتا دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ سلو کو یہ کیسی بیماری لگی ہے جس سے یہ بالکل سدھر گیا ہے، صبح بھی اُٹھ گیا ہے اور سیر کرنے بھی چلا گیا ہے ورنہ یہ کام تو کبھی اس کے ابا جی کی ڈانٹ بھی نہیں کرا سکی۔

''آہ ..... ! کتنا خوبصورت سماں ہے ..... !'' ملیخا بڑے سُرور میں بولا، ''کتنی پیاری ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے ..... ! ایسی ہوا سے تو ہم بگولوں کی آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے ..... ! بقول اقبال:

فضا نیلی نیلی، ہوا میں سُرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

''کیا ..... ! کیا بکواس کر رہے ہو ..... ؟ اور میرا کیا ہوگا ..... ؟'' سلو چیخا، ''میں ایک ایک منٹ گن گن کر گزار رہا ہوں۔ تم چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ یونہی ہوا میں معلق رہوں ..... ؟''

''کیا ہرج ہے! تم تو کہہ رہے تھے کہ انسان دوستی نبھانا خوب جانتے ہیں، بس یہی ہے تمھاری دوستی؟''

''ہاں بس یہی ہے! اس سے زیادہ میں قربانی نہیں دے سکتا، کوئی بھی نہیں دے سکتا، کیا تم دے سکتے ہو؟''

''ہاں....! یا شاید نہیں۔ پتا نہیں تم انسان کس قسم کی قربانی چاہتے ہو ..... ؟'' ملیخا زِچ ہو کر بولا۔

''وہ دونوں باتیں کرتے کرتے سلو کے کھیت کی طرف نکل گئے وہاں گلابو کنویں پر پانی بھر رہی تھی، وہ بھی اسی طرف چل پڑے۔ اتنے میں اُنھوں نے دیکھا کہ سلو کے کھیت میں آگ لگ گئی۔

''ارے ..... میرے کھیت میں تو آگ لگی ہے .....!'' سلو چیخا۔

''لگتا ہے میرے ساتھی آ گئے .....!'' ملیخا بولا، ''اچھا سلو میں فوراً جاتا ہوں ..... ورنہ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے تمھارا سارا کھیت جلا دیں گے۔''

یہ کہہ کر ملیخا سلو کے قالب سے نکلا اور بگولے کی شکل میں کھیت کی جانب بڑھا تا کہ اس کے ساتھی اسے دیکھ لیں۔ گلابو نے جو دیکھا کہ ایک آگ کا بگولا اس کے بھائی کے پاس بھی پہنچ گیا تو اس نے دوڑ کر پانی کا بھرا ہوا مٹکا بگولے پر ڈال دیا.....اور بگولا وہیں بجھ گیا۔ باقی بگولوں نے جو اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھا تو وہیں سے واپس لوٹ گئے۔

''گلابو...! یہ تم نے کیا کیا...؟'' سلو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، وہ اب اپنے قالب میں واپس آ چکا تھا،

''میرا دوست مارا گیا!'' سلو چیخنے لگا تو اسے ملیخا کے ہیولے سے آواز آئی:

ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی

''ملیخا...میرا دوست....ملیخا! میرے کھیت کو بچانے کے لیے قربان ہو گیا.....اس نے تو مجھ سے بھی بڑی قربانی دے دی....!''

''یار سلو ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو ..... ؟ کون ملیخا ..... ؟ کیا میرے علاوہ بھی تمھارا کوئی دوست تھا ..... ؟'' شوکی سلو کو اُٹھاتا ہوا حیرت سے بولا جو اس کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر نکل آیا تھا، ''لگتا ہے تمھاری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے، چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، اب وہ واپس آ چکے ہیں۔''

اور سلو چپ چاپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا، اسے لگا کہ واقعی اب اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔

* * * *

بکری کی نصیحت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بکری گھاس کی تلاش میں ایک سرسبز چراہ گاہ میں آ پہنچی، وہاں ہرطرف بہار اپنا رنگ دکھلا رہی تھی۔ بہت خوبصورت منظر تھا، ٹھنڈے پانی کی ندیاں رواں دواں تھیں۔ بے شمار پھل دار اور سایہ دار درخت لہلہا رہے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں دور سے ہی سنائی دے رہی تھیں جس نے اس چراہ گاہ کی خاموشی میں جان ڈال دی تھی۔ بکری جب کھانے سے فارغ ہوئی تو اس نے ادھر اُدھر دیکھا، وہاں قریب ہی ایک گائے بھی گھاس چر رہی تھی۔

''سلام گائے خالہ... کیسے مزاج ہیں؟'' بکری نے جھک کر ادب سے سلام کیا۔

''مزاج کیا پوچھتی ہو... بس کٹ رہی ہے جیسے تیسے زندگی!'' گائے اداسی سے بولی۔

''ایسا کیا ہوگیا خالہ.... کیوں اتنی اداس اور دکھی ہو؟'' بکری نے حیرانی سے پوچھا۔

''اپنی تو قسمت ہی بُری ہے، اپنی جان کو روتی رہتی ہوں... غریبوں کا بس ہی کہاں چلتا ہے، جو نصیب میں لکھا ہے وہ بھگت رہے ہیں!''

''پھر بھی کچھ بتلاؤ کہ ہوا کیا ہے... ہوسکتا ہے کہ میں کچھ مشورہ دے دوں، تمھارا مالک تو اچھا ہے نا تمھارے ساتھ..؟'' بکری گائے خالہ کا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

''ارے خدا نہ کرے کہ کسی کا انسان سے واسطہ پڑے، اس کی ساتھ تو بھلائی کر کے پچھتاوا ہی ملتا ہے۔ دودھ کم دو تو بڑ بڑاتا ہے، اگر کمزور ہو جاؤ تو بیچ کھاتا ہے یا کاٹ ڈالتا ہے۔ ہم بے زبان جانوروں کو قابو کرنے کے ایسے ایسے ہتھکنڈے آتے ہیں اسے کہ بس۔ میں اپنا دودھ پلا پلا کر اس کے بچوں کو پالتی ہوں، اور وہ ہماری نیکی کا یہ صلہ دیتا ہے... توبہ توبہ!''

''دیکھو خالہ! سچی بات کڑوی لگتی ہے لیکن میں وہی کہوں گی جو میرے دل کو لگتی ہے... یہ

خوبصورت ہری بھری چراہ گاہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، ندی کا کنارہ اور گھنے درختوں کا سایہ.... یہ نعمتیں اور خوشیاں ہر کسی کو میسر نہیں ہیں، ہم بے زبان جانور بھلا خود کہاں یہ سہولتیں حاصل کر سکتے ہیں، یہ سب بہاریں اور مزے تو انسان کی ہی بدولت ہیں، اسی قید میں ہماری خوشی پوشیدہ ہے۔''

''ارے بے وقوف بکری ہے تو پھر بھی قید کی زندگی نا.... کاش میں جنگل کی کھلی فضا میں آزاد رہ سکتی۔'' گائے ناگواری سے بولی۔

''جنگل میں جا کر آزادی سے رہ کر دیکھ لو خالہ.... سو طرح کا کھٹکا ہے، ہر وقت جان کا خطرہ ہے، اس خوف کی زندگی سے اللہ بچائے....! ہم پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے بہت اچھے حال میں رکھا ہے، اس کا گلہ کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ اگر تم اس آرام کی اہمیت کو سمجھو اور اس کی قدر کرو تو انسان کا گلہ کبھی نہ کرو۔''

گائے بکری کی یہ بات سن کر بہت شرمائی، اس کو انسان سے گِلے پر شرمندگی ہونے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا:

''یوں تو تم بہت چھوٹی سی ہو بی بکری، لیکن تمھاری بات دل کو لگتی ہے۔ واقعی جو ہمیں کھانے کو دیتا ہے اس کا گلہ کرنا جائز نہیں۔'' گائے نے معذرت والے انداز میں بکری سے کہا اور آئندہ کبھی انسان کے کاموں پر نہیں پچھتائی۔

(علامہ اقبال کی نظم سے ماخوذ)

* * * *

بیداری

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

زوہیب فٹ بال اٹھائے جب گراونڈ میں پہنچا تو دیکھا کہ کوچ نوید کو کچھ اہم نقطے بتا رہا ہے۔زوہیب کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اوراس نے اپنی فٹ بال اس زور سے زمین پر ماری کہ وہاں موجود سبھی لوگ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔اس نے کوچ کا ہاتھ پکڑا اور اسے گراونڈ سے باہر لے آیا،کوچ جو اس سے عمر میں خاصا بڑا تھا اور کوچ ہونے کی حیثیت سے استاد والی عزت دیے جانے کا مستحق تھا،لیکن زوہیب اس کی بالکل عزت نہیں کرتا تھا۔

’’میں نے تمھیں پہلے بھی کہا تھا کہ میچ جیتنے کے حوالے سے جو بھی اہم نقطے ہوں وہ صرف مجھے بتایا کرو... اور تم اس معمولی سے لڑکے نوید کو بتا دیتے ہو جس کا باپ میرے انکل کے آفس کا چپراسی تھا،کیا یہ میرا مقابلہ کرسکتا ہے؟‘‘ زوہیب کوچ کو منُہ دکھاتے ہوئے بولا،اس سے پہلے کہ کوچ کچھ بولتا وہاں ان کا سپروائزر آ گیا جس نے نوجوانوں کی پریکٹس کے لیے یہ تربیتی کیمپ لگایا تھا۔اس نے زوہیب کی بات سن لی تھی،وہ پہلے بھی کئی بار زوہیب کے رویے پر سرزنش کر چکا تھا۔

’’زوہیب آپ سُدھر جائیں تو بہتر ہے،اس طرح دھاندلی سے یا کوچ کو دھمکی دینے سے آپ اچھی کارکردگی نہیں دکھا سکتے۔میچ ہمیشہ محنت،ٹیم ورک اور باہمی اتفاق سے ہی جیتا جاتا ہے‘‘۔

’’جی سر، میں بھی کوچ کو یہی کہہ رہا تھا کہ تم صرف ایک کھلاڑی کو ہی کیوں اہم نقطے بتاتے ہو مجھے بھی بتایا کرو... میرا مطلب ہے کہ ہم سب کو بتایا کرو‘‘۔

’’آپ شاید بھول رہے ہیں کہ نوید ٹیم کا کپتان ہے،کوچ کپتان سے کسی دوسرے موضوع پر بھی بات کرسکتا ہے،اور جو نقطہ کپتان کو سمجھایا جاتا ہے وہ پوری ٹیم کے لیے نہیں ہوتا‘‘۔

''جی سر! سمجھ گیا''۔ زوہیب اتنا کہہ کر وہاں سے کھسک گیا، اسے معلوم تھا کہ سپروائزر سے پنگا لیا تو میچ سے ہی باہر کر دے گا۔

زوہیب اور نوید دسویں کلاس کے طالب علم تھے، گو کہ مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے، لیکن اپنے اپنے سکول کی فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے سکول کی جانب سے اس سینٹر میں پریکٹس کے لیے آتے تھے۔ زوہیب کے والد شہر کی مشہور و معروف شخصیت تھے اور ان کا بہت اثر رسوخ تھا۔ جبکہ نوید کے والد ایک معمولی سے سیکیورٹی گارڈ تھے اور ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈیوٹی پر ہی شہید ہو گئے تھے، ان کی وفات کے بعد ادارے کی جانب سے کچھ بھی نہیں ملا سوائے اس کے کہ چند مخیّر حضرات نے از راہِ ہمدردی چند ہزار روپے اکٹھے کر کے ذاتی طور پر انھیں دے دیے تھے جو نوید کے والد کے کفن دفن میں ہی کام آ گئے تھے۔ گھر کی ساری ذمہ داری نوید پر آ گئی تھی، وہ صبح سکول جاتا اور شام کو ایک سٹور میں ملازمت کرتا تھا۔ نوید فٹ بال کا بھی بہت اچھا کھلاڑی تھا جس کی وجہ سے اس کے سکول کا نام مشہور ہوا تھا اس لیے اس کے اساتذہ چاہتے تھے کہ وہ کسی اچھے کوچ سے تربیت لے کر مزید بہتر کھیلے۔ اس تربیت کے لیے وہ بمشکل وقت نکالتا تھا لیکن شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، اور پھر اپنی محنت کے بل بوتے پر آگے بڑھنا اور نام کمانا تو ہر ایک کا حق ہے، نوید بھی چاہتا تھا کہ وہ آگے بڑھے اور اپنی محنت سے ملک کا نام روشن کرے، اس میں صلاحیت بھی تھی اس لیے اس کو فٹ بال ٹیم کا کپتان بھی بنا دیا گیا تھا۔

نوید جیسے نوجوانوں پر حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر صادق آتا ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

زوہیب اپنے والد کا نام استعمال کر کے ہر جگہ اپنے رعب سے جگہ بنانا چاہتے تھا، کوچ نے اسے بہت بار سمجھایا کہ محنت کرو ورنہ ٹیم سے نکال دیے جاؤ گے۔ زوہیب کو محنت کرنے کی عادت ہی نہیں تھی کیونکہ کبھی اس کے والدین نے اسے یہ بتایا ہی نہیں تھا کہ دنیا میں محنت کر کے اپنی جگہ بنائی جاتی ہے، اس کے والدین تو بس اس کے ناز اٹھاتے تھے۔ ایسے والدین بچوں کی

ہر فرمائش پوری کرتے ہیں لیکن اچھے طریقے سے ان کی تربیت نہیں کرسکتے جس کا نتیجے میں وہ بچے عملی دنیا میں آ کر کبھی نہ کبھی ضرور بھگتتے ہیں۔ اپنے رویے کی وجہ سے زوہیب بھی فٹ بال ٹیم سے اور اس تربیتی سینٹر سے نکال دیا گیا۔ جبکہ نوید اپنی اچھی کارکردگی اور محنت سے اچھے نتائج دیتا رہا اور ایک دن قومی ٹیم میں بھی منتخب ہو گیا جیسا کہ اس کے والد کی آرزو تھی۔

جس دن کپتان کی حیثیت سے نوید اور اس کی ٹیم ورلڈ کپ کے لیے بین الاقوامی دورے پر جا رہے تھے، ایئر پورٹ کے باہر نوید کی ملاقات زوہیب سے ہوئی، جو ٹیکسی چلا رہا تھا اور کوئی سواری چھوڑنے کے لیے ائیر پورٹ آیا تھا، نوید کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اور وہ بے یقینی سے زوہیب کی طرف بڑھا تو زوہیب اپنا منہ چھپا کر ٹیکسی میں بیٹھنے لگا، لیکن زوہیب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''تم زوہیب ہی ہو نا!.... جو ہماری ساتھ فٹ بال کھیلتے تھے؟ تم اور اس حال میں..؟'' نوید کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی دیکھ کر وہ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

''اتنی حیرت سے کیا دیکھتے ہو یار...! ہاں میں وہی زوہیب ہوں جو تم سب کو دھمکیاں دیا کرتا تھا، مگر وہ بہت پرانی بات ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ میرے والد دیوالیہ ہو گئے تھے، اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور دنیا ہی چھوڑ گئے۔ ان کا کاروبار ختم ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی محنت اور ایمانداری سے کاروبار کرنے کی بجائے دھونس دھمکی سے کام لیا کرتے تھے۔ جس طرح میں فٹ بال ٹیم سے آؤٹ ہو گیا تھا اس طرح ایک دن میرے والد بھی کاروباری دنیا سے باہر کر دیے گئے، سب کچھ بک گیا اور ہم فٹ پاتھ پر آ گئے تو مجھے یہ ٹیکسی چلا کر گزر اوقات کرنا پڑی''۔

''مجھے بہت افسوس ہوا تمھاری کہانی سن کر۔'' نوید کی آنکھوں میں آنسو تھے زوہیب کی بدحالی و بے بسی پر، اسے معلوم تھا کہ کسی کی ناکامی پر خوش نہیں ہوا جاتا بلکہ دکھ اور افسوس کیا جاتا ہے، کیونکہ ایسا وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے، خصوصاً ان پر جو اپنے عروج کے دور میں خدا کا شکر، عاجزی اور اپنے سے کم تر پر رحم نہیں کرتے۔

''تم دکھی کیوں ہو گئے ہو یار.... یہ میری بدقسمتی ہے! تمھارا تو اب عروج کا زمانہ ہے تم فخر

کرو اور خوشی مناؤ، جاؤ تمھیں دیر ہورہی ہوگی، مجھ جیسے ناکام انسان پر اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔'' زوہیب نے طنز کیا۔

''کیا میں تمھارے لیے کچھ کرسکتا ہوں؟'' نوید نے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا، ''کیا تمھیں ابھی بھی فٹ بال کا شوق ہے۔'' یہ سن کر زوہیب کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''ہاں ہاں بالکل ہے، اکثر میں فٹ بال گراؤنڈ کا چکر لگاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کاش اس وقت میں نے محنت کرلی ہوتی تو میں بھی قومی ٹیم میں شامل ہوتا اور یہ برے دن نہ دیکھنے پڑتے۔''

''تم اب بھی کھیل سکتے ہو اور قومی ٹیم میں شامل ہو سکتے ہو، بس ذرا سی محنت کرنا ہوگی۔''

''کیا واقعی؟ لیکن اب تو مجھے کوئی بھی اپنی تربیتی ٹیم میں شامل نہیں کرے گا کیونکہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے، میری سفارش کرنے والے والد بھی نہیں رہے!'' زوہیب دکھ سے بولا، اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

''کیا میرے پاس کبھی کوئی سفارش تھی؟'' نوید نے الٹا زوہیب سے سوال کیا، ''میں تو سرکاری سکول کا ایک معمولی سا طالب علم تھا''۔

''نہیں، تمھارے پاس کوئی سفارش نہیں تھی، لیکن تم تو محنتی تھے نا، محنت پر یقین رکھتے تھے، اور میں سفارش پر!''

''تو پھر کون جیتا؟ محنت یا سفارش؟'' نوید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

''یقیناً تمھاری محنت! تم محنت کے دھنی تھے، کام کام اور کام پر یقین رکھتے تھے۔'' زوہیب سر جھکا کر بولا۔

''تو کیا محنت کسی ایک انسان کی میراث ہوتی ہے... کوئی دوسرا نہیں کرسکتا؟'' نوید نے پھر پوچھا۔

''نہیں! لیکن میرے جیسا نکما انسان شاید محنت بھی نہیں کرسکتا۔ میرے والد کا گھر تک نہیں رہا، اب ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں جو میں اپنی اس کمائی سے بمشکل دیتا ہوں۔''

زوہیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم سب کچھ کر سکتے ہو، یہ ٹیکسی چلانے کے لیے بھی تو دن رات محنت ہی کر رہے ہو۔تم اپنی محنت سے اپنے والد کا کھویا ہوا نام اور کاروبار بھی دوبارہ کھڑا کر سکتے ہواور فٹ بال ٹیم میں بھی شامل ہو سکتے ہو،اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا،تم چاہوتو اپنی محنت اور لگن سے اتنا کچھ حاصل کر سکتے ہو کہ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''کیا واقعی؟''زوہیب اس کے ہاتھ پکڑ کر بولا،اس نے تو کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا، اسے تو صرف فرمائشیں کرنے کی عادت تھی یا سفارش کو جانتا تھا۔ٹیکسی بھی بہ حالت مجبوری چلا رہا تھا۔

''ہاں بالکل! پہلے جو گھر تھا وہ تمھارے والد کا تھا لیکن اب جو کچھ تم محنت سے حاصل کرو گے وہ تمھارا ہوگا،جس پر تم بھی فخر کر سکو گے،کیا تم نے اقبالؒ کا یہ شعر نہیں سنا!

وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہیں

خود میں عقابی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔میرے والد ایک ادارے میں سیکیورٹی گارڈ تھے... محافظ تھے،اور ایک دن اپنے ادارے کی حفاظت کے لیے ڈاکوؤں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے،لیکن جاتے جاتے مجھ میں عقابی روح بیدار کر گئے،جس نے مجھے کبھی فارغ بیٹھنے ہی نہیں دیا،بس ایک لگن تھی کہ کچھ کرنا ہے۔صبح پڑھائی اور شام نوکری، گھر والوں کے لیے عزت کی روٹی کمانا ایک بچے کے لیے آسان نہیں ہوتا۔اس کے بعد فٹ بال کا جنون بھی مجھے کبھی آرام کرنے نہیں دیتا تھا۔فٹ بال کی پریکٹس کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں ہوتا تھا کیونکہ جہاں کام کرتا تھا وہ بہت ذمہ داری کا کام تھا وہاں سے ایک گھنٹے کی چھٹی بھی نہیں ملتی تھی،بس پھر رات دس بجے کے بعد فٹ بال کی پریکٹس کرتا تھا اور اس کے بعد گھر آ کر پڑھائی۔''

''مجھے حیرت ہے کہ تم اتنے بہت سے کام کیسے کر لیتے تھے؟اور پھر آدھی رات تک فٹ

بال کی پریکٹس...! میں تو مر ہی جاتا۔‘‘

’’ایک بات یاد رکھو دوست کہ محنت کرنے سے کوئی نہیں مرتا، ہاں فارغ رہنے سے انسان روحانی طور پر ضرور مر جاتا ہے، اور اگر روح مر جائے تو انسان مردہ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے میرے سب کام خود بخود ہوتے چلے گئے، بس نیت اچھی تھی کہ سب کام ٹھیک سے کرلوں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو یتیم کرتا ہے تو اس کا والی وارث اور سر پرست خود بن جاتا ہے، محنت کرنے کا حوصلہ بھی وہی دیتا ہے اس کا صلہ بھی۔ اور کسی کام کی لگن انسان کو سونے ہی نہیں دیتی۔ اب میں نے پرائیویٹ گریجویشن بھی کرلیا ہے، اور اس دکان کا مالک بھی بن گیا جس پر کبھی کام کیا کرتا تھا کیونکہ اس کا مالک اپنی دکان مجھے سونپ کر خود حج پر چلا گیا تھا اور اب وہیں اپنا کاروبار شروع کرلیا، میری ایمانداری دیکھ کر مجھے اس دکان کا مالک بنا گیا۔ فٹ بال میں میری کارکردگی تو تمھارے سامنے ہے، ایک میچ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے، دورے پر دورے لگتے رہتے ہیں، ساری دنیا گھوم چکا ہوں۔‘‘

’’ہاں بالکل! میں تمھارے سارے میچ بڑے شوق سے دیکھتا ہوں اور اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں کہ کبھی ہم ساتھ پریکٹس کیا کرتے تھے۔‘‘ زوہیب مسکراتے ہوئے بولا۔ اتنے میں نوید کے کوچ کی آواز آ گئی، فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔

’’اچھا مجھے اپنا فون نمبر دے دو، جب واپس آؤں گا تو تم سے رابطہ کروں گا، تمھیں فٹ بال کی پریکٹس کراؤں گا اور تم بھی ایک دن قومی ٹیم میں شامل ہو جاؤ گے، کرو گے نا پریکٹس؟‘‘ نوید نے جاتے جاتے پوچھا

’’ہاں بالکل! اب تو مجھ میں بھی عقابی روح بیدار ہو چکی ہے۔ جب تم اپنے دورے سے واپس آؤ گے تو میری اچھی کارکردگی دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔‘‘ زوہیب نے مسکراتے ہوئے نوید کو خدا حافظ کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک تھی اور اس کو بھی اپنی منزل آسمانوں میں نظر آ رہی تھی۔

* * * *